

# الشرعیہ

گوجرانوالہ

ماہنامہ

جلد: ۲۹ / شماره: ۰۳ / مارچ ۲۰۱۸ء مطابق جمادی الاخریٰ ۱۴۳۹ھ

مؤسس: ابوعمار زاہد الراشدی O مدیر مسئول: محمد عمار خان ناصر

۲	محمد عمار خان ناصر	اسلامی شریعت اور حلالہ / ایک سوال نامہ کے مختصر جوابات	خطرات
۶	ڈاکٹر محی الدین غازی	اردو تراجم قرآن پر ایک نظر - ۴۰	آراء و افکار
۱۳	ڈاکٹر محمد اکرم ورک	درک ”درادراک“	
۱۹	مولانا مفتی محمد زاہد	دینی مدارس میں عصری تعلیم کے تجربات و نتائج	حالات و واقعات
۲۳	ابوعمار زاہد الراشدی	موجودہ دور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات / تکفیر کی اتھارٹی، علماء یا حکومت؟	
۲۸	مولانا عبدالغنی محمدی	پیغام پاکستان: پس منظر اور پیش منظر	
۳۴	ڈاکٹر مختار احمد	تین طلاقوں کا مسئلہ	مباحثہ و مکالمہ
۳۸	محمد ندیم پشاوری	قرآن کریم میں خدا کے وعدوں کو سمجھنے میں غلطی	
۴۷	مولانا محمد رفیق شتواری	مدرسہ ڈسکورسز: سفر قطر کے احوال و تاثرات	اخبار و آثار
۵۳	ڈاکٹر عرفان شہزاد	”نماز کے اختلافات اور ان کا آسان حل“	بحارف و تنصیر

مجلس مشاورت: قاضی محمد روپس خان ایوبی - ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی - پروفیسر غلام رسول عدیم

حافظ صفوان محمد چوہان - سید متین احمد شاہ

مجلس تحریر: زاہد صدیق مغل - سمیع اللہ سعدی - عاصم بخش - محمد یوسف ایڈووکیٹ

حافظ محمد رشید - محمد بلال فاروقی - حافظ عبدالغنی محمدی

انتظامیہ: ناصر الدین خان عامر - عبدالرزاق خان - حافظ محمد طاہر

ذریعہ تعاون: سالانہ 400 روپے - بیرون ملک سے: 30 امریکی ڈالر

دفتر انتظامی: مکتبہ امام اہل سنت، جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ - 0306-6426001

خط کتابت کے لیے: ماہنامہ الشریعہ، پوسٹ بکس 331 گوجرانوالہ

ای میل: aknasir2003@yahoo.com - ویب سائٹ: www.alsharia.org

ناشر: حافظ محمد عبدالمتین خان زاہد - طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکو ڈروڈ، لاہور

## اسلامی شریعت اور حلالہ

ہمارے معاشرے میں دین و شریعت کے غلط اور بُری برہمالت فہم کے جو مختلف مظاہر پائے جاتے ہیں، ان میں سے ایک، حلالہ کی رسم ہے۔ مروجہ رسم کے مطابق حلالہ کا تصور یہ ہے کہ اگر شوہر، بیوی کو تین طلاقیں دے دے تو اب ان کے اکٹھا رہنے کے جواز کے لیے شرط ہے کہ عورت، عارضی طور پر کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے، اس سے جسمانی تعلق قائم کرے اور پھر طلاق لے کر پہلے شوہر کے پاس واپس آجائے۔ یعنی اس میں دو تین چیزیں پہلے سے طے ہیں: ایک یہ کہ یہ دوسرا نکاح وقتی اور عارضی مدت کی نیت سے ہوگا۔ دوسرا یہ کہ اس کا مقصد ہی پہلے شوہر کے لیے عورت کو حلال کرنا ہے۔ اور تیسرا یہ کہ اس سارے عمل میں عورت کی مرضی کی کوئی اہمیت نہیں، اسے بس ایک بتایا گیا پروہ سب پر پورا کر کے بہر حال پہلے شوہر کے پاس واپس آنا ہے۔

اسلامی شریعت میں حلالہ کے اس تصور کی کوئی بنیاد نہیں۔ شریعت میں جو قانون دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر شوہر دو دفعہ بیوی کو طلاق دینے کے بعد رجوع کر چکا ہو اور پھر تیسری مرتبہ بیوی کو طلاق دے دے تو اب وہ رجوع نہیں کر سکتا اور تیسری طلاق کے بعد وہ دونوں، میاں بیوی کے طور پر اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ عورت اب کسی دوسرے مرد سے ہی نکاح کرے گی اور یہ نکاح ہرگز عارضی تعلق کی نیت سے اور پہلے شوہر کے لیے عورت کو حلال کرنے کے ارادے سے نہیں ہوگا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نیت سے نکاح کرنے والے اور پہلے شوہر، جس کے لیے نکاح کیا جا رہا ہے، دونوں پر لعنت فرمائی ہے اور عارضی نکاح کرنے والے کو کرایے کے سائڈ سے تشبیہ دی ہے۔ اس طرح کا مقدمہ سامنے آنے پر سیدنا عمر نے دوسرے شوہر کو سخت زجر و توبیخ کی اور اسے پابند کیا کہ اب وہ اس نکاح کو قائم رکھے۔ نیز یہ کہ اگر اس نے پہلے شوہر کے لیے عورت کو حلال کرنے کی غرض سے اسے طلاق دی تو اسے بدکاری کی پاداش میں سسٹا رکھا جائے گا۔ جمہور فقہائے اسلام حلالہ کی نیت سے کیے گئے نکاح کو منعقد ہی نہیں مانتے اور نہ اس کی بنیاد پر عورت کو پہلے شوہر کے لیے حلال قرار دیتے ہیں۔ صرف حنفی فقہاء نے ایک فقہی نکتے کی بنیاد پر اس طریقے کو اصولاً و اخلاقاً ناجائز قرار دیتے ہوئے صرف قانونی اثرات کی حد تک معتبر تسلیم کیا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ شریعت میں دراصل، عورت کو پہلے شوہر کے لیے حلال کرنے کا کوئی طریقہ تجویز نہیں

کیا گیا، بلکہ تیسری طلاق کے بعد دونوں کے اکٹھے رہنے پر پابندی عائد کی ہے اور عورت سے کہا ہے کہ اب وہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ ہی زندگی گزارے۔ البتہ اگر کسی وجہ سے اتفاقاً دوسرے شوہر سے بھی علیحدگی ہو جائے اور عورت اپنی آزادانہ مرضی سے دوبارہ پہلے شوہر کے نکاح میں جانا چاہے اور دونوں کو یہ اطمینان ہو کہ وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے رشتہ نکاح کو نباہ سکیں گے تو ایسی صورت میں شریعت انہیں دوبارہ نکاح کی اجازت دیتی ہے۔ اس طریقے کا، جیسا کہ واضح ہے، حلالہ کے مروجہ طریقے سے کوئی تعلق نہیں جو سرتاسر جہالت اور حرام حیلوں پر مبنی طریقہ ہے۔ اس میں شوہر کی غلطی کی سزا بیوی کو دی جاتی ہے جو غیر منصفانہ بھی ہے اور عورت کی تذلیل بھی۔

البتہ یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ تیسری طلاق کے بعد شریعت میں مرد اور عورت کو اکٹھا رہنے سے کیوں روکا گیا ہے؟ اس کی حکمت عموماً یہ بتائی جاتی ہے کہ اس پابندی کے ذریعے سے، شوہر سے بیوی کو اذیت پہنچانے کا ایک ہتھیار چھین لیا گیا ہے، کیونکہ اگر شوہر کو طلاق دینے کے بعد عدت کے اندر بیوی سے رجوع کر لینے کا لامحدود اختیار حاصل ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نہ تو اپنی ناپسندیدہ بیوی کو مکمل حقوق کے ساتھ نکاح میں رکھے گا اور نہ اسے بندھن سے آزاد کرے گا تا کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح کر لے۔ گویا زمانہ جاہلیت کے غیر اخلاقی طرز عمل کے تناظر میں شریعت میں شوہر پر یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ طلاق کے بعد رجوع کا حق صرف دو مرتبہ استعمال کر سکتا ہے، تیسری مرتبہ طلاق دینے پر اسے یہ حق حاصل نہیں ہوگا۔

یہ حکمت جزوی طور پر درست معلوم ہوتی ہے، لیکن اس سے حکم کی مکمل توجیہ نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ حکم کے مطابق پابندی صرف شوہر کے رجوع کرنے پر نہیں، بلکہ میاں بیوی کے اکٹھا رہنے پر عائد کی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خود عورت بھی بدستور اس شوہر کے نکاح میں رہنے پر راضی ہو، تب بھی اس کی گنجائش نہیں اور عورت کو بہر حال کسی دوسرے آدمی سے ہی نکاح کرنا پڑے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پابندی صرف عورت کو ضرر سے بچانے کے لیے نہیں لگائی گئی، بلکہ اس میں کوئی دوسرا پہلو بھی ہے۔ ہماری رائے میں اس پابندی سے رشتہ نکاح کے تقدس کے حوالے سے شریعت کی مخصوص حساسیت کا اظہار ہوتا ہے۔ شریعت کی نظر میں یہ رشتہ محض مادی یعنی جسمانی و سماجی ضروریات کے پہلو سے اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ اسے ایک خاص طرح کا روحانی تقدس بھی حاصل ہے جو یہ تقاضا کرتا ہے کہ انسان اس رشتے کو معمولی سمجھتے ہوئے غیر سنجیدہ اور لاپرواہی قسم کا رویہ اختیار نہ کرے۔ انسانی نفسیات میں اس حساسیت کو زندہ رکھنے کے لیے ناگزیر ہے کہ اس رشتے کو قائم کرنے اور اسے ختم کرنے کے ضمن میں اس نوعیت کی کچھ پابندیاں عائد کی جائیں۔ شریعت کا منشا یہ ہے کہ نکاح کا رشتہ خوب سوچ سمجھ کر قائم کیا جائے اور ہمیشہ قائم رکھے جانے کے عزم کے ساتھ وجود میں لایا جائے۔ اگر کسی وجہ سے نباہ نہ ہو سکے تو اسے ختم کرنے کا فیصلہ بھی پوری طرح سوچ سمجھ کر اور اسی صورت میں کیا جائے جب موافقت اور ہم آہنگی کے امکانات بالکل ختم ہو جائیں۔ یہاں تک کہ طلاق دینے کا فیصلہ کیا جائے تو بھی ایک مخصوص مدت کے اندر فیصلے پر نظر ثانی کی گنجائش باقی رکھی گئی ہے، تاہم مذکورہ زاویہ نظر سے شریعت کی منشا یہ ہے کہ نظر ثانی کی گنجائش لامحدود نہیں، بلکہ محدود اور کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہوتا کہ طلاق کے حوالے سے غیر

سنجیدگی اور لابی پرن کی نفسیات پیدا نہ ہو سکے۔

اسی نوعیت کی حساسیت ہمیں ظہار کے قانون میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ قبل از اسلام کی عرب معاشرت میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہہ دیتا کہ تم مجھ پر میری ماں کی طرح حرام ہو تو اسے حتمی اور ابدی حرمت کا مستوجب سمجھا جاتا تھا۔ اسلامی شریعت میں ابتداءً اسی قانون کو برقرار رکھا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رشتہ نکاح میں اس طرح کے غیر ذمہ دارانہ رویے کو شریعت بھی سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس تشبیہ کے بعد مرد اور عورت، میاں بیوی کے طور پر اکٹھے نہ رہیں۔ تاہم ایک خاص واقعہ رونما ہونے پر اللہ تعالیٰ نے اس قانون میں آسانی پیدا کرتے ہوئے ترمیم کردی اور سورۃ المجادلہ میں فرمایا کہ بیوی کو ماں سے تشبیہ دینے کے بعد، دونوں کے بطور میاں بیوی رہنے کی گنجائش تو ہے، لیکن اس کے لیے شوہر کو، بالترتیب، ایک غلام آزاد کرنے یا دو مہینے کے مسلسل روزے رکھنے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی صورت میں اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ غور کیا جائے تو تیسری طلاق کے بعد رجوع کی گنجائش باقی نہ رکھنے کے قانون میں بھی اسی نوعیت کی حکمت دکھائی دیتی ہے۔

اس بحث سے ان فقہاء کے نقطہ نظر کا وزن بھی واضح ہوتا ہے جو تیسری طلاق کے بعد رجوع کے عدم امکان کی پابندی کو اس صورت سے متعلق قرار دیتے ہیں جب شوہر نے الگ الگ موقعوں پر صورت حال کا بغور جائزہ لے کر بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کیا ہو۔ اگر اس طرح کے دو فیصلوں کے بعد تیسری مرتبہ طلاق دی گئی ہو تو شریعت کی عائد کردہ زیر بحث پابندی کی حکمت پوری طرح برقرار رہتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر کسی شخص نے وقتی جذبات کے زیر اثر نادانی میں بیک وقت تینوں طلاقیں دے دی ہوں تو قانون کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے لیے رجوع کی گنجائش باقی رکھی جائے اور بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کے عدد کو بنیاد بنانے کے بجائے اس نکتے کو زیادہ اہمیت دی جائے کہ اس نے طلاق کا حق بہر حال ایک ہی موقع پر استعمال کیا ہے۔ علامہ ابن رشد المالکیؒ اس نکتے کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یوں لگتا ہے کہ جمہور فقہاء نے سد ذریعہ کے طور پر (یعنی تاکہ لوگ طلاق کے معاملے میں جری نہ ہو جائیں)، تین طلاقوں کے معاملے میں سختی کا طریقہ اختیار کیا (اور بیک وقت تین طلاقوں کو نافذ قرار دے دیا) ہے، لیکن اس سے وہ شرعی رخصت اور وہ آسانی جو شریعت کا مقصود ہے، فوت ہو جاتی ہے، یعنی جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں کیا ہے کہ ہو سکتا ہے، اللہ اس کے بعد (موافقت اور مصالحت کی) کوئی راہ پیدا کر دے۔“ (بدایۃ المجتہد ج ۲، ص ۶۲)

## ایک سوال نامہ اور اس کے مختصر جوابات

1۔ پاکستان میں مسلکی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر ابھرنے والی سیاسی قوتوں خاص طور پر بریلوی مسلک سے وابستہ ”تحریک لبیک یا رسول اللہ“ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ایسی تحریکیں اپنے مسلکی فکر کی نمائندگی کرتی ہیں اور ان سے عوامی سطح پر پائے جانے والے مذہبی جذبات و رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے۔

2۔ پاکستان کی سیاست میں اس نئی مذہبی سیاسی قوت کی آمد کے معاشرتی اور سیاسی محرکات و وجوہات کیا ہیں؟  
جواب: بریلوی مسلک کی پیروی پاکستانی عوام کی اکثریت کرتی ہے، تاہم کچھ عرصے سے مذہبی سیاست میں اس طبقے کی نمائندگی کوئی موثر شخصیت یا جماعت نہیں کر رہی۔ تحریک لبیک اسی احساس محرومی کا اظہار اور اس خلا کو پر کرنے کی کوشش ہے۔

3۔ ختم نبوت، توہین رسالت وغیرہ کے عنوان سے قائم مذہبی سیاسی جماعتیں اور ان کے شدت پسندی بیانیے کے حوالے سے ریاست کا کیا ریسپانس ہونا چاہیے؟

جواب: ریاست کو آئین میں طے کردہ حدود کے مطابق ایسی تحریکوں کے جائز مطالبات کو وزن دینا چاہیے اور حدود سے متجاوز مطالبات کی، حکمت عملی اور فراست کے ساتھ مزاحمت کرنی چاہیے۔

4۔ مذکورہ بالا مقاصد کے تحت سیاسی میدان میں قدم رکھنے والی مذہبی سیاسی جماعت کس طرح آنے والے انتخابات کے ذریعے پاکستان کے سیاسی و سماجی ماحول پر اثر انداز ہو سکتی ہے؟

جواب: پاکستانی سیاست میں مذہبی جماعتوں کی حیثیت پریشگر و پس کی ہے جو مذہبی حساسیت رکھنے والے ایٹوز میں تو ایک موثر کردار ادا کر سکتی ہیں، لیکن انتخابی سیاست کے عمومی نتائج پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں کر سکتیں، الا یہ کہ وقتی حالات اور ماحول سے ایسی کوئی فضا بن جائے، جیسے نائن الیون کے بعد متحدہ مجلس عمل کو ملی۔

5۔ آپ دیوبندی سیاسی جماعتوں اور بریلوی مسلک کی نئی ابھرتی ہوئی جماعت جیسے تحریک لبیک یا رسول اللہ کے تقابل کے بارے میں کیا نقطہ نظر رکھتے ہیں؟

جواب: ان دونوں طبقوں کی constituencies الگ الگ ہیں، اس لیے میرے خیال میں بظاہر براہ راست ٹکراؤ کا کوئی خاص امکان نہیں۔ البتہ اگر بریلوی مسلک کی نمائندہ جماعتوں کو سیاسی میدان میں ایک خاص سطح پر accommodate نہ کیا گیا تو وہ زیادہ شدت کے ساتھ فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کا راستہ اختیار کریں گی۔ اس لیے دوسری مذہبی سیاسی قوتوں اور خاص طور پر دیوبندی قیادت کو چاہیے کہ انھیں سیاسی میدان میں آگنج کر کے مذہبی سیاست کے مرکزی دھارے میں لانے کی کوشش کریں۔

## اردو تراجم قرآن پر ایک نظر مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں - ۴۰

(۱۳۵) فہم یوزعون کا ترجمہ

یوزعون کا لفظ قرآن مجید میں تین مقامات پر آیا ہے، یہ فعل مضارع ہے، لفظی لحاظ سے اس کا ماضی وزع بھی ہو سکتا ہے اور اوزع بھی ہو سکتا ہے، گوکہ معنوی پہلو سے وزع ہی درست لگتا ہے جس کے معنی روکنے کے ہیں، اور لشکر کو قابو میں رکھنے کے بھی ہیں، جبکہ اوزع کے معنی ترغیب و توفیق دینے کے ہیں، اہل لغت کے مطابق ایزع توزیع کے ہم معنی ہو کر تقسیم کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے، بہر حال یہ مفہوم اگر ہو بھی تو استعمال میں رائج نہیں ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ تینوں مقامات پر اس لفظ کے مختلف ترجمے کئے گئے ہیں:

(۱) وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ۔ (انمل: ۱۷)

”سلیمان کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے“

(سید مودودی)

”اور جمع کیے گئے سلیمان کے لیے اس کے لشکر جنوں اور آدمیوں اور پرندوں سے تو وہ روکے جاتے تھے“ (احمد رضا

خان)

”اور سلیمان کے لیے جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے اور قسم وار کیے جاتے تھے“ (فتح

محمد جاندھری)

”سلیمان کے سامنے ان کے تمام لشکر جنات اور انسان اور پرند میں سے جمع کیے گئے (ہر قسم کی) الگ الگ درجہ

بندی کر دی گئی“ (محمد جونا گڑھی)

”اور سلیمان کے جائزے کے لیے ان کا سارا لشکر، جنوں انسانوں اور پرندوں میں سے، اکٹھا کیا گیا اور ان کی

درجہ بندی کی جا رہی تھی“ (امین احسن اصلاحی، یہاں جائزے کے لیے نہیں بلکہ ہم پر نکلنے کے لیے مراد ہے، کیونکہ اس

کے فوراً بعد ایک ہم پر نکلنے کا تذکرہ ہے)

”اور سلیمان کے لیے اکٹھا کر دیے گئے جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر، تو وہ پوری طرح منظم تھے“ (امانت

اللہ اصلاحی)

(۲) وَيَوْمَ نُحْشِرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مَّمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ۔ (النمل: ۸۳)

”اور ذرا تصور کرو اُس دن کا جب ہم ہر امت میں سے ایک فوج کی فوج اُن لوگوں کی گھیر لائیں گے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے، پھر ان کو (ان کی اقسام کے لحاظ سے درجہ بدرجہ) مرتب کیا جائے گا“ (سید مودودی)

”اور جس دن اٹھائیں گے ہم ہر گروہ میں سے ایک فوج جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتی ہے تو ان کے اگلے روکے جائیں گے کہ پچھلے ان سے آئیں“ (احمد رضا خان)

”اور جس روز ہم ہر امت میں سے اس گروہ کو جمع کریں گے جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے تھے تو ان کی جماعت بندی کی جائے گی“ (فتح محمد جالندھری)

”اور جس دن ہم ہر امت میں سے ان لوگوں کے گروہ کو جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے گھیر گھا کر لائیں گے، پھر وہ سب کے سب الگ کر دیے جائیں گے“ (محمد جونا گڑھی)

”اور جس دن ہم ہر امت میں سے ان لوگوں کی ایک فوج اکٹھا کریں گے جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے تھے، پس وہ پوری طرح منظم ہوں گے“ (امانت اللہ اصلاحی)

(۳) وَيَوْمَ يُحْشِرُ أَعْدَاءَ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ۔ (فصلت: ۱۹)

”اور ذرا اُس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے، اُن کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا“ (سید مودودی)

”اور جس دن اللہ کے دشمن آگ کی طرف ہانکے جائیں گے تو ان کے اگلوں کو روکیں گے“ (احمد رضا خان)

”اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف چلائے جائیں گے تو ترتیب وار کر لیے جائیں گے“ (فتح محمد جالندھری)

”اور جس دن اللہ کے دشمن دوزخ کی طرف لائے جائیں گے اور ان (سب) کو جمع کر دیا جائے گا“ (محمد جونا گڑھی)

”اور جس دن اللہ کے دشمن دوزخ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے، پس وہ پوری طرح منظم ہوں گے“ (امانت اللہ اصلاحی)

اللہ اصلاحی)

مذکورہ ترجموں پر نظر ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایک ہی لفظ اور ایک ہی اسلوب (فہم یوزعون) کا بعض مترجم تینوں مقامات پر الگ الگ ترجمہ کرتے ہیں، مثال کے طور پر صاحب تفہیم نے پہلے مقام پر قابو میں رکھنا، دوسرے مقام پر اقسام کے لحاظ سے درجہ بدرجہ مرتب کرنا اور تیسرے مقام پر روکنا ترجمہ کیا ہے۔

موخر الذکر دونوں آیتوں کا بہت سے لوگوں نے روکنے کا ترجمہ کیا ہے، وزع کے معنی روکنا ہوتے ہیں مگر وہ روکنا چلتے ہوئے شخص کو روکنا نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی کام سے کسی کو باز رکھنا ہوتا ہے۔ اسی کو قابو میں رکھنا کہتے ہیں۔

لشکر کے ساتھ جب یہ لفظ آتا ہے تو اس کا مفہوم لشکر کو منظم اور ڈسپلن میں رکھنا ہوتا ہے۔ اور یہی مفہوم مذکورہ بالا

تینوں مقامات پر زیادہ بہتر طریقے سے فٹ ہوتا ہے۔

### (۱۳۶) غنم کا ترجمہ

غنم کا لفظ قرآن مجید میں تین جگہ آیا ہے، اس لفظ کے اندر بھیڑ اور بکری دونوں شامل ہوتے ہیں، (الغنم) القطیع من المعز والضأن. المعجم الوسيط (۶۶۴/۲)  
صرف بھیڑ کے لیے ضأن اور صرف بکری کے لیے معز آتا ہے، قرآن مجید میں مذکورہ ذیل ایک مقام پر دونوں ایک ساتھ استعمال ہوئے:

ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ مِّنَ الضَّأْنِ الْأُنثَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ الْأُنثَيْنِ۔ (الانعام: ۱۴۳)

(یہ بڑے چھوٹے چار پائے) آٹھ قسم کے (ہیں) دو (دو) بھیڑوں میں سے اور دو (دو) بکریوں میں سے (یعنی ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ)۔ (فتح محمد جالندھری)  
ہشت جفت آفریدہ است: از گوسفند دو جفت و از بز دو جفت. (خرمدل)

Eight pairs: Of the sheep twain, and of the goats twain. (Pickthall)

(Take) eight (head of cattle) in (four) pairs: of sheep a pair, and of goats a pair; (Yusuf Ali)

اس آیت کے ترجمے میں ایک غلطی عام طور سے ہوئی ہے اور وہ یہ کہ ثمانية أزواج کا ترجمہ آٹھ جوڑے یا آٹھ قسمیں کیا گیا ہے، حالانکہ قسمیں یا جوڑے چار ہیں، البتہ ان چار قسموں کے افراد یا چار جوڑوں کی جوڑیاں آٹھ ہیں۔ اس پہلو سے اوپر درج کئے گئے ترجمے صحیح طلب معلوم ہوتے ہیں۔ آٹھ قسم، ہشت جفت، Eight pairs لفظ کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔

اس آیت کے ترجموں کو یہاں ذکر کرنے سے یہ واضح کرنا بھی مقصود ہے کہ عربی کے ان دونوں الفاظ یعنی ضأن اور معز کے مختلف زبانوں میں متبادل الفاظ کیا ہیں۔ ان دونوں الفاظ کے مقابلے میں غنم کا لفظ چونکہ ضأن اور معز یعنی بھیڑ اور بکری دونوں پر مشتمل ہوتا ہے، اس لیے اس کا ترجمہ صرف بھیڑ یا صرف بکری کرنے سے لفظ غنم کا حق ادا نہیں ہوتا ہے۔

مندرجہ ذیل تینوں آیتوں کے ترجموں کا اس پہلو سے جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

(۱) وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوْ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ۔ (الانعام: ۱۴۶)

”اور یہودیوں پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے اور گایوں اور بکریوں سے ان کی چربی حرام کر دی تھی سوا اس کے جو ان کی پیٹھ پر لگی ہو یا اونچھڑی میں ہو یا ہڈی میں ملی ہو“ (فتح محمد جالندھری)

”این چیز هائی بود کہ بر شما حرام کرده ایم) و بر بھو دیان هر (حیوان) ناخنداری (یعنی: درندگان کہ دارای پنجه های قوی، و پرندگان شکاری کہ از چنگال نیرومند برخوردارند) حرام کرده بودیم، و از گاؤ گوسفند (تھما) پیہا و چربیہای

آنها را بر آنان حرام نموده بودیم، مگر پیہ و چربیہائی کہ بر پشت اینہا یا در اندرونہ (ولابلائی احتشاء و امعاء) قرار دارد و یا پیہ ہا و چربیہائی کہ آمیزہ می استخوان گردیدہ است“ (خرمدل)

Unto those who are Jews We forbade every animal with claws. And of the oxen and the sheep forbade We unto them the fat thereof save that upon the backs or the entrails, or that which is mixed with the bone. (Pickthall)

For those who followed the Jewish Law, We forbade every (animal) with undivided hoof, and We forbade them that fat of the ox and the sheep, except what adheres to their backs or their entrails, or is mixed up with a bone. (Yusuf Ali)

(۲) وَدَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَسَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحَكْمِهِمْ شَاهِدِينَ۔  
(الانبیاء: ۷۸)

”اور داؤد اور سلیمان (کا حال بھی سن لو کہ) جب وہ ایک کھیتی کا مقدمہ فیصلہ کرنے لگے جس میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو چر گئی (اور اسے روند گئی) تھیں اور ہم ان کے فیصلے کے وقت موجود تھے“ (فتح محمد جالندھری)  
” (و یاد کن) داؤد و سلیمان را، ہنگامی کہ در بارہ ی کشتزاری کہ گوسفندان مردمانی، شبانگاہان در آن چریدہ و تباہش کردہ بودند، داوری می کردند، و ما شاهد داوری آنان بودیم“ (خرمدل)

And remember David and Solomon, when they gave judgment in the matter of the field into which the sheep of certain people had strayed by night: We did witness their judgment. (Yusuf Ali)

And David and Solomon, when they gave judgment concerning the field, when people's sheep had strayed and browsed therein by night; and We were witnesses to their judgment. (Pickthall)

(۳) قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَى غَنَمِي۔ (طہ: ۱۸)  
”انہوں نے کہا یہ میری لٹھی ہے۔ اس پر میں سہارا لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں“  
(فتح محمد جالندھری)

”پاسخ داد کہ این عصای من است و بر آن تکیہ می کنم و با آن گوسفندانم را می رانم و برای آنها برگ می ریزم“  
(خرمدل)

He said: This is my staff whereon I lean, and wherewith I bear down branches for my sheep, (Pickthall)

He said, "It is my rod: on it I lean; with it I beat down fodder for my flocks;" (Yusuf Ali)

مذکورہ بالا ترجموں کو دیکھنے پر ایک بڑی اہم اور دلچسپ بات سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ تمام اردو مترجمین غنم کا ترجمہ بھیڑ نہیں کر کے بکری کرتے ہیں، اور تقریباً تمام انگریزی مترجمین اس کا ترجمہ Sheep کرتے ہیں جس کے معنی بھیڑ کے ہیں، اور تمام فارسی مترجمین اس کا ترجمہ گوا سفند کرتے ہیں، جو بھیڑ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر ذہن اس طرف جاتا ہے کہ ہندوستان میں بھیڑ کے مقابلے میں بکری کا رواج زیادہ ہے، اس لیے ترجمہ کرتے وقت اس کا اثر زیادہ رہا، جبکہ دوسرے علاقوں میں بھیڑ کا رواج ترجمہ پر اثر انداز رہا۔

مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ مذکورہ تینوں مقامات پر غنم کا ترجمہ مویشی یا ریوڑ یا ”بھیڑ بکری“ ہونا چاہیے، تاکہ لفظ میں موجود معنی کی وسعت میں کوئی کمی واقع نہیں ہو۔ غنم ترجمہ کرتے وقت بھیڑ اور بکری دونوں کا ذکر کرنے کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ قرآن مجید میں (جیسا کہ اوپر گزرا) ایک مقام پر صراحت کے ساتھ بھیڑ اور بکری دونوں کا خصوصیت کے ساتھ الگ الگ ذکر کیا گیا ہے۔

### (۱۳۷) اولیاء کا ترجمہ

اولیاء کا لفظ لولی کی جمع ہے، جس کا اصل مطلب دوست ہے، فیروز آبادی لکھتے ہیں:

الْوَالِيُّ: الْقُرْبُ وَالذُّنُو، الْمَطَرُ بَعْدَ الْمَطَرِ، وَوَالِيَةُ الْأَرْضِ، بِالضَّمِّ۔ وَالْوَالِيُّ: الْأَسْمُ مِنْهُ، وَالْمَحَبُّ،

وَالصَّدِيقُ وَالنَّصِيرُ۔ الْقَامُوسُ الْمَحِيطُ

بعض مقامات پر اس کا ترجمہ لوگوں نے معبود اور کارساز وغیرہ بھی کیا ہے، لیکن کبھی محل کلام خود تقاضا کرتا ہے کہ اس لفظ کا ترجمہ دوست کیا جائے، کوئی اور ترجمہ وہاں مناسب نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے ذیل کی آیتوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

(۱) وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَقُولُ أَأَنْتُمْ أَضَلَلْتُمْ عِبَادِي هَؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ۔ قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ وَلَكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّى نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا۔ (الفرقان: ۱۷، ۱۸)

”اور وہ وہی دن ہوگا جبکہ (تمہارا رب) ان لوگوں کو بھی گھیر لائے گا اور ان کے ان معبودوں کو بھی بلالے گا جنہیں آج یہ اللہ کو چھوڑ کر پوج رہے ہیں، پھر وہ ان سے پوچھے گا ”کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا؟ یا یہ خود راہ راست سے بھٹک گئے تھے؟“ وہ عرض کریں گے ”پاک ہے آپ کی ذات، ہماری تو یہ بھی مجال نہ تھی کہ آپ کے سوا کسی کو اپنا مولا بنائیں مگر آپ نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو خوب سامان زندگی دیا حتیٰ کہ یہ سبق بھول گئے اور شامت زدہ ہو کر رہے“ (سید مودودی)

قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ كَمَا تَرَى جَعَلْتَهُمْ ذُرِّيَّةً لِيُحْسِنُوا الصَّلَاةَ وَالْيَاكُوفَ لِلْحَنَابِلِ الْكَافِرِينَ۔ (محمد حسین نجفی)

”وہ کہیں گے کہ پاک ہے تیری ذات ہمیں یہ حق نہیں تھا کہ ہم تجھے چھوڑ کر کسی اور کو اپنا مولا بنائیں“ (محمد حسین نجفی)

”وہ عرض کریں گے پاکی ہے تجھ کو ہمیں سزاوار (حق) نہ تھا کہ تیرے سوا کسی اور کو مولیٰ بنائیں“ (احمد رضا خان)

”کہیں گے تو پاک ہے ہمیں یہ کب لائق تھا کہ تیرے سوا کسی اور کو کارساز بناتے“ (احمد علی)

”وہ کہیں گے تو پاک ہے ہمیں یہ بات شایان نہ تھی کہ تیرے سوا اوروں کو دوست بناتے“ (فتح محمد جالندھری)  
 ”وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ذات ہے خود ہمیں ہی یہ زیبا نہ تھا کہ تیرے سوا اوروں کو اپنا کارساز بناتے“ (محمد  
 جونا گڑھی)

(۲) وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَهؤُلَاءِ اِذَاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ۔ قَالُوا سُبْحَانَكَ اَنْتَ  
 وَلِيُنَّا مِنْ دُونِهِمْ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ۔ (سبا: ۲۰، ۲۱)  
 ”اور جس دن وہ لوگوں کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے کہے گا (پوچھے گا) کیا یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کرتے  
 تھے؟ وہ کہیں گے پاک ہے تیری ذات! تو ہمارا آقا ہے نہ کہ وہ (ہمارا تعلق تجھ سے ہے نہ کہ ان سے) بلکہ یہ تو جنات کی  
 عبادت کیا کرتے تھے ان کی اکثریت انہی پر ایمان و اعتقاد رکھتی تھی“ (محمد حسین نجفی)  
 قَالُوا سُبْحَانَكَ اَنْتَ وَلِيُنَّا مِنْ دُونِهِمْ كَمَزِيدٍ تَرَجَّيْ حَسْبَ ذٰلِكَ هِيَ:۔  
 ”تو وہ جواب دیں گے کہ ”پاک ہے آپ کی ذات، ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ کہ ان لوگوں سے“۔ (سید  
 مودودی)

”وہ عرض کریں گے پاک ہے تجھ کو تو ہمارا دوست ہے نہ وہ“ (احمد رضا خان)  
 ”وہ کہیں گے تو پاک ہے تو ہی ہمارا دوست ہے۔ نہ یہ“ (فتح محمد جالندھری)  
 ”وہ کہیں گے تیری ذات پاک ہے اور ہمارا ولی تو تو ہے نہ کہ یہ“ (محمد جونا گڑھی)  
 ”وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے ان کے بالمقابل تو ہمارا کارساز ہے“ (امین احسن اصلاحی)  
 غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب سوال ان سے کیا جائے گا جن کو لوگ معبود مانتے تھے، تو وہ جواب میں یہ کیوں  
 کہیں گے کہ ہم نے تیرے سوا کسی کو مولا یا سرپرست یا کارساز نہیں بنایا۔ مولیٰ یا سرپرست یا کارساز تو انہیں معبود  
 بنانے والوں نے بنایا تھا، اس سلسلے میں صفائی تو معبود بنانے والوں کو پیش کرنی ہوگی، یہاں تو جن کو معبود بنایا گیا انہوں  
 نے اپنی طرف سے یہ وضاحت پیش کی ہے کہ ہم نے ان سے کوئی دوستی نہیں کی جس کی وجہ سے ہم پر انہیں اس طرح کی  
 کوئی شددینے کا کوئی الزام آئے۔  
 غور طلب بات یہ بھی ہے کہ اکثر حضرات نے دوسری آیت میں ولی کا ترجمہ دوست کیا ہے، لیکن انہیں لوگوں نے  
 پہلی آیت میں اولیاء کا ترجمہ دوست کرنے کے بجائے مولیٰ اور کارساز کیا۔  
 غرض لفظ کا تقاضا بھی یہی ہے، اور پورے کلام کا تقاضا بھی یہی ہے کہ دونوں مقامات پر دوست ترجمہ کیا جائے۔

### (۱۳۸) کلمات کا ترجمہ

مذکورہ ذیل دونوں آیتوں میں کلمات کا لفظ آیا ہے، صاحب تدریس نے اس کا ترجمہ نشانیاں کیا ہے، بعض نے اس  
 سے صفتیں مراد لیا ہے، بعض نے باتیں ترجمہ کیا ہے۔ مولانا امانت اللہ اصلاحی کی رائے ہے کہ لفظ آلاء کی طرح کلمات کا  
 ترجمہ ”کرشمے“ کرنا زیادہ مناسب ہے۔

(۲) وَكُلُوا نَمًا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرٍ أَقْلَامٍ وَالْبُحْرُ يُمْدُهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفَدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ  
إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ (لقمان: ۲۷)

”روئے زمین کے (تمام) درختوں کے اگر قلمیں ہو جائیں اور تمام سمندروں کی سیاہی ہو اور ان کے بعد سات سمندر اور ہوں تاہم اللہ کے کلمات ختم نہیں ہو سکتے، بیشک اللہ تعالیٰ غالب اور باحکمت ہے،“ (محمد جو نا گڑھی، یہاں تمام سمندروں کے بجائے سمندر ہونا چاہئے)

”اور اگر زمین میں جتنے پیڑ ہیں سب قلمیں ہو جائیں اور سمندر اس کی سیاہی ہو اس کے پیچھے سات سمندر اور تو اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی بیشک اللہ عزت و حکمت والا ہے،“ (احمد رضا خان)

”اور اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں (سب کے سب) قلم ہوں اور سمندر (کا تمام پانی) سیاہی ہو (اور) اس کے بعد سات سمندر اور (سیاہی ہو جائیں) تو خدا کی باتیں (یعنی اس کی صفتیں) ختم نہ ہوں۔ بیشک خدا غالب حکمت والا ہے،“ (فتح محمد جالندھری)

”اور اگر زمین میں جو درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر سات سمندروں کے ساتھ (روشنائی بن جائیں) جب بھی اللہ کی نشانیاں قلم بند نہیں ہو سکتیں۔ بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے،“ (امین احسن اصلاحی)

(۲) قُلْ لَوْ كَانِ الْبُحْرُ مِدَادًا لَكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفَذَ الْبُحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا۔ (الکہف: ۱۰۹)

”کہہ دو کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے (لکھنے کے) لئے سیاہی ہو تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہو جائے اگرچہ ہم ویسا ہی اور (سمندر) اس کی مدد کو لائیں،“ (فتح محمد جالندھری)

”کہہ دیجئے کہ اگر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لئے سمندر سیاہی بن جائے تو وہ بھی میرے رب کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا، گو ہم اسی جیسا اور بھی اس کی مدد میں لے آئیں،“ (محمد جو نا گڑھی)

”اے محمد، کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں، بلکہ اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کفایت نہ کرے،“ (سید مودودی)

”کہہ دو اگر میرے رب کی نشانیاں کو قلم بند کرنے کے لیے سمندر روشنائی بن جائے تو میرے رب کی نشانیاں کے ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا اگرچہ ہم اس کے ساتھ اسی کے مانند اور سمندر ملا دیں،“ (امین احسن اصلاحی)

دوسری آیت میں (لو سکان) آیا ہے، اس کے لحاظ سے ترجمہ ماضی کا ہونا چاہئے، نہ کہ مستقبل کا جیسا کہ عام طور سے مترجمین نے کیا ہے، درست ترجمہ یوں ہوگا: کہہ دو اگر میرے رب کی نشانیاں کو قلم بند کرنے کے لیے سمندر روشنائی بن جاتا تو میرے رب کی نشانیاں کے ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جاتا اگرچہ ہم اس کے ساتھ اسی کے مانند اور سمندر ملا دیتے۔

## درک ”درادراک“

مسیحیت، ہندومت، بدھ مت، اور دیگر مذاہب کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ انہوں نے ترک دنیا اور رہبانیت کے تیشے سے انسانی جسم کو صرف اس لیے گھائل کر دیا تا کہ انسانی روح کو بیدار کیا جاسکے، لیکن اس غیر طبی تعلیم اور جان سوزی کے نتیجے میں روح کی شمع بھی گل ہو کر رہ گئی۔ اہل کلیسا نے خانقاہوں میں بسیرا کر لیا، ہندوؤں اور بدھوں نے جنگلوں کا رخ کر لیا۔ مسیحیت کی غیر فطری تعلیمات کے رد عمل میں پروان چڑھنے والے مغربی فکر و فلسفہ میں یورپ کے ارباب فکر و دانش نے مادہ پرستی کی رو میں بہتے ہوئے نہ صرف روح کے ہر تقاضے کو نظر انداز کر دیا بلکہ روح ہی کا انکار کر دیا اور اس عالم رنگ و بو کو ہی انسانیت کا منہا قرار دیا۔ جسم کی تو خوب پرورش کی، لیکن روح کو کچل کر رکھ دیا۔ نتیجے کے طور پر وہ انسان تیار ہوا جو ان اخلاقی اقدار ہی سے عاری ہے جو اس کا طرہ امتیاز ہے۔ مغرب کی اخلاقی اقدار کسی روحانی محرک سے محروم ہیں۔ اخلاقی قدروں کی ترویج میں بھی مارکیٹنگ کی نفسیات کا رفرما ہے۔ "Eathical guide book for call girl" جیسی کتابوں کا سرعام فروخت کے لیے پیش کیا جانا مغرب کے اخلاقی بحران اور دیوالیہ پن کا نکتہ کمال ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مذاہب عالم کے زوال کے بعد مغربی تہذیب بھی اپنے زوال کی منازل طے کر رہی ہے، اور اس زوال کی سب سے بڑی وجہ ”فطرت“ کے نام پر فطرت سے بغاوت ہے۔ بقول اقبال

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

مغربی تہذیب کا سب سے تباہ کن پہلو یہ ہے کہ اس نے روح اور بدن میں افتراق پیدا کر دیا ہے، حالانکہ انسان کی شخصیت روح اور بدن کی تالیف اور امتزاج سے عبارت ہے۔ ایسا کوئی مذہب اور کوئی نظریہ کامیاب نہیں ہو سکتا جو روح اور بدن میں سے ایک کو ابھارے اور دوسرے کو کچل دے۔ مغربی تہذیب نے گذشتہ کئی صدیوں میں فکری ارتقاء کا کٹھن سفر طے کیا ہے، مسلسل فکری ارتقاء اور تجربات کے نتیجے میں اس کے ہاں کئی تصورات اور نظریات اب مسلمہ عقائد کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اہل مغرب اب ان نظریات پر کوئی سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مغرب نے سماجی، معاشرتی اور اخلاقی حوالے سے جو تجربات کیے ہیں، اس کے نتیجے میں ان کے ہاں یہ سوچ پختہ ہو رہی ہے کہ

\* چیئر مین شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ IP/G اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ۔ drmakramvirk@yahoo.com

انسانیت اپنے سماجی ارتقاء کی آخری سیڑھی پر قدم رکھ چکی ہے۔ مغرب میں "The End of History" کے عنوان سے لکھی جانے والی کتب اسی سوچ کی مظہر ہیں۔ اس انداز فکر پر یہ سوال بہر حال موجود ہے کہ پھر انسان مسلسل روحانی اور اخلاقی بحران کا شکار کیوں ہے؟ کمی کہاں پر ہے؟

اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے آزادی اظہار رائے، انسانی جان کی حرمت، انسانی مساوات، سماجی انصاف، حقوق نسواں، مذہبی آزادی، عدل اجتماعی اور امن عالم جیسے تصورات کو مذہبی اور روحانی بنیادیں فراہم کیں۔ مذاہب عالم اور جدید مغربی فکر و فلسفہ کے مقابل اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے روح اور جسم دونوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھا ہے۔ مذاہب عالم میں شاید اسلام ہی واحد دین ہے جس نے خالصتاً روحانی غلطیوں پر بھی مالی جرمانے کی سزا عائد کی ہے۔ حکم ہے کہ اگر رمضان کا روزہ ٹوٹ جائے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔ قسم ٹوٹنے کی صورت میں تین مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم ہے۔ اپنی بیوی سے ظہار کی صورت میں ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم ہے۔ حتیٰ کہ قتل جیسے سنگین معاملے میں مقتول کے ورثاء ضرورت مند ہوں تو وہ دیت پر صلح کر سکتے ہیں۔ گویا اسلام کی نظر میں ضرورت مندوں کی دادرسی سے ہی روحانی سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ اسلام کے نظام عبادت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا بنیادی فلسفہ عدل اجتماعی کا قیام ہی ہے۔

دین اسلام پر اس انداز سے غور کرنے سے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں انسان کی معاشی، سماجی اور معاشرتی زندگی اور حقوق کی اہمیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

اعلان نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سماجی زندگی لوگوں کے لیے آپ کی نبوت و رسالت کی دلیل ٹھہری۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی قرآن و سنت اور اسوۂ رسولؐ سے یہی اُخذ کیا کہ وہی شخص اللہ تعالیٰ کی نظر میں معتبر ہے جو اس کے بندوں سے اپنے معاملات ٹھیک رکھتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ (م ۲۳ھ) نے ایک شخص کے حال کی تحقیق کے لیے گواہ طلب کیے تو ایک آدمی نے گواہی دی کہ موصوف ایک شریف آدمی ہیں۔ حضرت عمر فارقؓ نے اس سے بڑا اہم سوال کیا کہ کیا آپ اس کے پڑوسی ہیں؟ اس نے عرض کی کہ نہیں۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ نے اس کے ساتھ کبھی لین دین کیا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ پھر فرمایا کہ کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم نے اسے رکوع و سجود اور ذکر اذکار میں مشغول دیکھا ہوگا؟ اس کہا جی ہاں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم اسے نہیں جانتے اور پھر حضرت عمرؓ نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کسی ایسے شخص کو بلاؤ جو تمہیں جانتا ہو۔ گویا حضرت عمرؓ کی نظر میں کسی انسان کی اصل پہچان عبادت و ریاضت سے نہیں بلکہ اس کے سماجی رویے سے ہوتی ہے۔

امام محمد بن حسن الشیبانی (م ۲۸۵ھ) فقہ حنفی کے مدون اول تھے ان سے کسی نے سوال کیا کہ آپؐ نے زہد اور رفاق کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی کہ لوگ اس کو پڑھتے اور ان کے دلوں میں تقویٰ پیدا ہوتا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے کتاب البیوع لکھ دی ہے۔ یعنی جو شخص کتاب البیوع میں حلال و حرام کے احکام پر مسلسل عمل کرے گا اس میں

تدین ضرور پیدا ہوگا۔ دنیا دار العمل ہے اور عمل کا ”معیاری اظہار“ حلال و حرام کی تمیز اور مثبت سرگرمیوں سے ہوتا ہے۔ اسلام کی نظر میں سماجی زندگی کی اس اہمیت کے پس منظر میں ہمارے قابل قدر تلمیذ محمد تہامی بشر علوی کی تحریروں کا زیر نظر مجموعہ ”درادراک“ ایک قابل قدر کاوش ہے۔ یہ تصنیف کل تین حصوں پر مشتمل ہے، جبکہ زیر تبصرہ حصہ کتاب کے آخری دو حصے ہیں۔ فاضل محقق نے اپنی ان تحریروں میں سماجی رویوں کی تشکیل میں اسلام کے کردار کی اہمیت کو خوب اجاگر کیا ہے۔ موصوف نے داعیانہ اسلوب اور پورے درد دل کے ساتھ مختلف طبقات میں موجود خرابیوں کی نشاندہی کی ہے اور ان خرابیوں کے اسباب و وجوہ کا تجزیہ کرنے کے بعد حل بھی تجویز کیا ہے۔

ہمیں نہایت تاسف سے اعتراف کرنا چاہیے کہ آج علماء کرام عمل کے معیاری اظہار کے فروغ کے بجائے تبلیغ محض کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ دین کی بجائے مسلک کی تبلیغ روز افزوں ہے، نادان لوگوں نے اپنے اپنے مسلک کو ہی کل دین سمجھ لیا ہے۔ دینداری کے بجائے نفن دین داری کا خوب دور دورہ ہے۔ ظاہری وضع قطع اور عبادت کے نام پر چند عادات اور مرنے جینے کی مخصوص رسموں کے علاوہ دین کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اور جس مسلک کی دین کے نام سے تبلیغ کی جا رہی ہے اس کا غالب حصہ بھی مابعد الطبعیاتی مباحث سے متعلق ہے۔ نور و بشر، علم غیب، حاضر و ناظر، مجرم، میلاد اور گیارہویں کی مجالس کے جواز اور عدم جواز کی بحثیں ہی زندہ موضوعات ہیں۔ عام لوگوں میں یہ سوچ پختہ ہو رہی ہے کہ مذہب کا ریاست، سیاست اور معاشرت وغیرہ سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ لوگ بجا طور پر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ دین کا چونکہ دنیوی امور سے کوئی تعلق نہیں ہے، لہذا اس کے حقیقی فوائد و ثمرات کے لئے فوت ہونا ضروری ہے۔ معاشرتی اصلاح اور سماجی رویوں کی تشکیل میں اسلام کے کردار کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ علماء کرام لوگوں کے سماجی اور نفسیاتی مسائل اور عرف سے بڑی حد تک نابلد ہیں۔ مذہبی طبقے میں دعوت و تبلیغ کی جگہ فتویٰ بازی سکے رائج الوقت ہے، فتویٰ بازی میں عرف اور سماجی رویوں کا مطالعہ کرنے کی بجائے محض فتاویٰ جات کی قدیم کتب سے استفادہ کافی سمجھا جاتا ہے۔ معاشرتی اصلاح اب مذہبی طبقے کی ترجیحات میں آخری درجے میں ہے۔ فاضل محقق نے دینی مدارس کے موجودہ کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے خوب لکھا ہے:

”ایک وقت تھا جب مدرسے تعلیمی ادارے ہوا کرتے تھے۔ پھر المیہ یہ ہوا کہ اب یہ مسلک پرستوں کے تحریکی ادارے بن کر رہ گئے ہیں۔ یہاں ”میں اور میرا مسلک“ عین حق اور میں اور میرے مسلک کے سوا مکمل باطل کا نفسیاتی شاکلہ تیار ہوتا ہے۔“

اقبال سے انتہائی معذرت کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے:

گلا تو گھونٹ دیا ”اہل مدرسہ“ نے ترا

کہاں سے آئے صد الا الہ الا اللہ

عام طور پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ”THE SOCIAL CONTRACT“ کا مصنف مشہور فرانسیسی مفکر اور دانشور ژاں ژاک روسو (۱۷۱۵ء-۱۷۷۸ء) انسانی تاریخ کا پہلا شخص ہے جس نے انسانی ضروریات اور اختیاجات کو اس کا ”حق“

ثابت کیا ہے۔ ہماری بد نصیبی ملاحظہ کیجئے کہ مغرب کی طرف سے آنے والی کوئی انسانی قدر جب شہرت دوام حاصل کرنے لگتی ہے تو ہم اسے قرآن وحدیث سے ثابت کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اگرچہ حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے وہ اس کو جہاں بھی پائے حاصل کر لے، لیکن اگر وہ جواہر پارہ براہ راست ہمارے علمی خزانے کا حصہ ہو اور ہم اپنی کورچشمی کی وجہ سے اس کو دیکھ ہی نہ پارے ہوں تو اس پر ماتم کے سوا کیا کیا جاسکتا ہے۔ اب بھلا کون ہماری اس بات پر غور کرے گا کہ انسانی تاریخ میں روسونہیں بلکہ اسلام نے سب سے پہلے انسانی ضروریات کو انسان کا ”حق“ ثابت کیا ہے۔ سورۃ الذاریات میں ہے:

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (۱۹/۵۱)

ترجمہ: اور ان مالوں میں سائل اور محروم لوگوں کا ”حق“ ہے۔

یہ آیت کی دور میں نازل ہوئی اور اس وقت تک زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی تھی۔ مطلب یہ کہ زکوٰۃ کی فرضیت سے پہلے ہی مسلمانوں کی تربیت اس ماحول میں ہو رہی ہے کہ اسلامی ریاست کے قیام کے بغیر بھی ان پر دوسرے مسلمانوں کی ضروریات کو پورا کرنا بطور ”حق“ لازم ہے۔ قرآن وسنت میں زکوٰۃ اور صدقہ جیسے الفاظ ”فریضہ“ اور ”حق“ کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ کسی چیز کو خیرات کے طور پر مانگنے اور حق کے طور پر طلب کرنے میں زمین وآسمان کا فرق ہے، لیکن ہماری غلط دینی تعبیرات کا نتیجہ یہ ہے کہ عام لوگوں کا تو کیا کہنا پڑھے لکھے لوگ بھی زکوٰۃ اور صدقہ کو خیرات کے ہم معنی ہی سمجھتے ہیں۔ فقیر شہر کا فتویٰ یہ ہے کہ فرض تو قرض کی طرح ہے جنت کا ٹکٹ تو صرف اس کے لیے کنفرم ہوگا جو ’خیرات‘ بانٹتا ہے۔ اس تبلیغ کا نتیجہ یہ ہے کہ آج باوسائل اور مقتدر طبقہ مزدور اور غریب کے لازمی حق کو نظر انداز کر کے صدقہ و خیرات کے نام پر اس کا استیصال رہا ہے۔ مقتدر طبقات کی نظر میں مزدور اور غریب کو اس کا حق دینے کی بجائے خیرات دینا پسندیدہ عمل ہے تاکہ اس کی گردن ہمیشہ اپنے مالک کے سامنے جھکی رہے اور وہ انہیں اپنا آقا و مولیٰ سمجھتا رہے۔ زیر نظر کتاب میں اس معاشرتی کجی کی ان الفاظ میں نشاندہی کی گئی ہے:

”پاکستان دنیا کا کم ترین مزدوری دینے والا ملک ہے، اور پاکستان ہی دنیا کا سب سے زیادہ خیرات کرنے والا ملک بھی ہے۔ ہمارے معاشرے کا یہ تضاد ایک بہت بڑی کجی کا اظہار ہے۔ ہم نے مزدوروں کے استحصال کو ایک معاشرتی قدر بنا دیا ہے۔ ہم پہلے ان کو کم مزدوری دے کر محتاج بناتے ہیں، پھر ان کی محتاجیوں سے مزید محتاجیاں جنم لیتی ہیں، اور پھر ہم صدقہ و خیرات سے ان محتاجیوں کی مدد کر کے ان کو اپنا احسان مند بھی بنا لیتے ہیں اور اس احسان مندی سے ایک طرف ہم اپنا کاروبار چمکاتے ہیں اور دوسری طرف ان کی دعاؤں سے جنت کے محل تعمیر کرا لیتے ہیں۔“

ایک غیر ہنرمند مزدور کے خاندان کو ماہانہ تقریباً 36,000 سے 40,000 ہزار روپے ہیں جبکہ حکومت نے کمال مہربانی سے مزدور کی کم از کم اجرت 13 سے 14 ہزار روپے مقرر کی ہے۔ جبکہ مزدوروں کا ایک طبقہ اس سے بھی کم ماہانہ تنخواہ پارہا ہے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ مذہب سے گہری عقیدت رکھنے والا سرمایہ دار بھی مزدور کو اس کا حق دینے کی

بجائے خیرات دینا ہی پسند کرتا ہے۔ کسی کی عزت نفس کا لحاظ، اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں کتنے رتبے کا کام ہے، کاش یہ بات ہم پر کھل جائے تو یقین کیجئے معاشرے کا مزاج ہی تبدیل ہو جائے۔ لوگ خیرات بھی رات کے اندھیرے میں دینا پسند کریں گے۔

دنیا کے تمام مذاہب نے مختلف طبقات کے حقوق کی نشاندہی اپنے اپنے اسلوب میں کی ہے، بالخصوص جدید مغربی معاشرے میں بنیادی انسانی حقوق کی تحریک کا منظم ظہور ہوا ہے۔ مغرب بجا طور پر انسانی حقوق کی جدید تحریکوں کا بانی ہے، لیکن محض حقوق کے مطالبات سے معاشرے میں ٹکراؤ کی نفسیات جنم لیتی ہیں سماجی سطح پر اس حوالے سے اسلام کا اسلوب بہترین ہے کہ حقوق کے شعور کے ساتھ اصل زور فرائض کی ادائیگی پر دیا جائے۔ جب ہر طبقہ اپنے فرائض کو ادا کرنے لگے تو کسی طبقے کے حقوق یا مال نہیں ہوں گے۔ بظاہر یہ بات معمولی نظر آتی ہے لیکن نتائج کے اعتبار سے یہ طرز عمل دور رس نتائج کا حامل ہے۔ مغرب میں اس طرز فکر کی ایک بڑی مثال حقوق نسواں کی جدید تحریک ہے جس نے عورت کو بھڑکا کر مرد کا مقابل بنا دیا ہے۔ جس کے نتیجے میں مغرب میں خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ عورتوں کا اپنے حقوق سے آگاہ ہونا بے شک ضروری سہی لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ عورت کے حوالے سے مرد پر بحیثیت باپ، بھائی اور شوہر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کا شعور اتنے تسلسل سے اجاگر کیا جائے کہ حقوق نسواں کی کسی تحریک کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ اس حوالے سے ہمارے فاضل تلمیذ نے آج کے معروضی حالات کے تناظر میں معاشرتی اصلاح کے لیے زیر نظر کتاب میں عورت کے حقوق اور مرد کے فرائض کے حوالے سے اہم نکات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ تفصیل کے لیے: ”نکاح کے بعد“، ”بیوی پر پابندیاں“، ”شادی کا فیصلہ“، ”رفیق حیات کا فیصلہ کیسے ہو؟“، کے عنوانات ملاحظہ فرمائیں۔

کسی معاشرے کی طاقت اس کا اتحاد اور یکجہتی ہے، اسلام کی برکت سے جب عربوں میں اتحاد و یگانگت کا ظہور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس اتحاد کا اپنے خصوصی فضل کے طور پر تذکرہ فرمایا اسی اتحاد کی بدولت وہ موقع پیدا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حقیقی معنوں میں ’خاک کے ذروں کو ہمدوش ثریا کر دیا‘، لیکن پھر اپنی ملت کو اقوام مغرب پر قیاس نہ کرنے والوں نے اس سبق کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا۔ خاک مدینہ و نجف کو اپنی آنکھوں کا سرمابنانے والی قوم فرقہ بندی کے عفریت کی نظر ہو گئی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ فرقہ واریت کا جن بے قابو ہو چکا ہے۔ مسئلہ صرف مذہبی تعصبات تک محدود نہیں رہا بلکہ ہمارے سماج میں فرقہ واریت کا ظہور کئی شکلوں میں ہو رہا ہے۔ اس وقت مسلم معاشرے کا اتحاد ذات برادری، مسلکی، فقہی، لسانی، جغرافیائی اور نسلی تعصبات کے طوفان میں بری طرح گھر چکا ہے۔ جس طبقے کے ذمے ان تعصبات کے خلاف سر پر کفن باندھ کر میدان کارزار میں نکلتا تھا اس کی نظر میں سرے سے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ہمارے مذہبی طبقے میں تو یہ موضوع سماجی مسئلہ کے طور کم ہی زیر بحث آتا ہے۔ اس تناظر میں فاضل مصنف نے اتحاد و یکجہتی کو پارہ پارہ کرنے والے منفی سماجی رویوں کو پوری قوت سے اجاگر کیا ہے۔ موصوف نے ”قبیلہ پرستی“، ”تعصبات اور قبیلہ پرستی خدا اور رسول کی نظر میں“، ”قبیلے سے باہر شادیاں“، ”بزرگوں کے طور طریقے“، ”اب

ایسا نہیں چلے گا، جیسے عنوانات کے تحت آج کے ایک زندہ مسئلہ کو موضوع بحث بنایا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ فاضل محقق بلدی فکر کے ساتھ زبان و بیان پر بھی گہری گرفت رکھتے ہیں۔ بعض جملے اتنے شاندار ہیں کہ گویا دریا کو زے میں بند کر دیا گیا ہو اس نوعیت کے جملے بجا طور پر ان کو ”اقوال زریں“ میں شمار کرنے کے لائق ہیں۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

﴿ ہمارا علاج قیمتی باتوں میں نہیں، ضروری باتوں میں ہے۔ ﴾

﴿ انسانی تعمیر سے دلچسپی میں مبتلاء احباب کو علیم سے زیادہ حکیم ہونا ضروری ہے۔ ﴾

﴿ لوگ اس خیال پر جے بیٹھے ہیں کہ تبدیلی حکمران بدلنے سے آئے گی حقیقت مگر یہ ہے کہ حکومت ہمارے بدلنے سے بدلے گی۔ ﴾

﴿ مدرسوں میں بندگی کو چھوٹا ہوا ادب ایک طرف طلبہ کے مزاج میں پستی پیدا کر رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف اساتذہ میں غرور بڑھا رہا ہوتا ہے۔ ﴾

﴿ قربانی کسی ”صاحبِ نصاب“ کے ”عمل“ کے طور نہیں بلکہ اپنے ”وفا شعاروں“ کی ”ادا“ کے طور پر ہی محبوب ہے۔ ﴾

اس وقت زیر نظر کتاب پر تفصیلی تبصرہ مقصود نہیں ہے تاہم مختلف مضامین پر نظر ڈالنے سے کتاب کی اس خصوصیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ”در ادراک“ ایک طرف ہمارے ہاں منفی سماجی رویوں کا بیان ہے تو دوسری طرف اصلاح معاشرہ کی کوششوں اور طریق کار پر ایک شاندار استدراک بھی ہے۔ توقع ہے کہ کتاب اپنے اسلوب بیان اور مصنف کے گہرے سماجی مطالعے اور تنقیدی نظر کی وجہ سے قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگی۔

## مدارس میں غیر نصابی سرگرمیاں

طلبہ کے سماجی اور تعلیمی رجحانات کا ایک جائزہ

صفحات: ۱۳۲

زیر اہتمام

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیپس اسٹڈیز

پوسٹ بکس نمبر 2110، اسلام آباد

pips@pakpips.com / 051-8359475-6

# دینی مدارس میں عصری تعلیم کے تجربات و نتائج

[۱۴ نومبر ۲۰۱۷ء کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ اور اقبال انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ڈائیاگنوسٹکس (IIRD) کے اشتراک سے ”دینی مدارس میں عصری تعلیم کے تجربات و نتائج“ کے عنوان پر منعقدہ سیمینار میں گفتگو]

بعد الحمد والصلوة!

میں سب سے پہلے تو مخدوم و مکرم حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب، جناب مولانا عمار خان ناصر صاحب، الشریعہ اکادمی کے ذمہ داران اور ادارہ اقبال برائے مکالمہ و تحقیق کے ذمہ دار حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس محفل میں حاضری کا اور اپنی گزارشات پیش کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔ میں انتہائی مختصر وقت میں چند موٹی موٹی باتوں کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کروں گا۔

دینی مدارس میں عصری تعلیم کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ یا کیا ہونا چاہیے؟

اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس زمانے میں بچے کی سوشلائزیشن یعنی بچے کو اپنی سوسائٹی کا، اپنے سماج کا حصہ بنانا کہ بچے کو اپنے معاشرے کی اقدار، معروف و منکر اور رہن سہن کا علم ہو، یہ مقصود ہوتا ہے۔ اس طرح کے کام عموماً بچے کو والدین سکھایا کرتے تھے، لیکن آج کے دور میں بچے کی سوشلائزیشن کا عمل بھی تعلیمی اداروں ہی کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ دینی مدارس میں ابتدائی عصری تعلیم کا ایک مقصد یہ ہو سکتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی مقصد ہونا چاہیے کہ ہمارے جتنے بھی بچے ہیں اور بڑے ہو کر جس لائن میں بھی وہ جانے والے ہیں، چاہے وہ عالم دین بننے والے ہوں، انجینئر بننے والے ہوں یا ڈاکٹر بننے والے ہوں، ان کی جو ابتدائی سوشلائزیشن ہو رہی ہے، وہ تقریباً یکساں ہو۔ اگر ہمارا بچہ شروع میں اسکول کی تعلیم سے بالکل ناواقف ہوگا تو اس بات کا امکان موجود ہے گا کہ وہ اپنے آپ کو سوسائٹی کا مکمل طور پر حصہ نہ سمجھ سکے۔

دوسری طرف بھی اس چیز کی ضرورت ہے کہ اسکول میں دینی بنیادی تعلیم، قرآن کی تعلیم کو لازمی حصہ بنایا جائے۔ کہنے کی حد تک تو یہ حصہ ہے، لیکن اس کو فعال اور متحرک بنانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں مختلف تجربات مختلف جگہوں پر ہوئے ہیں۔ مثلاً بہت ساری جگہوں پر حفظ کے ساتھ ساتھ ایک آدھ گھنٹہ نکال کر بچے کو اسکول کی تعلیم دے

\* شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد

دی جاتی ہے اور تھوڑے وقت میں بچہ بہت کچھ کور کر لیتا ہے۔ ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اصلاً تو بچہ اسکول جا رہا ہوتا ہے، لیکن پارٹ ٹائم قرآن کریم حفظ کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں بلکہ کامیاب مثالیں موجود ہیں۔

عام طور پر اس طرح کی چیزوں میں سب سے بڑا سوال یہ اٹھتا ہے کہ حفظ کی تعلیم کے ساتھ اگر دوسری چیز اٹیچ ہوگی یا دوسری تعلیم کے ساتھ حفظ اٹیچ ہوگا تو حفظ کمزور رہے گا، لیکن حفظ کے کمزور رہنے یا نہ رہنے کا دار و مدار اس چیز پر ہوتا ہے کہ حافظ بننے کے بعد اس نے قرآن مجید کی طرف توجہ کتنی دی ہے۔ اگر کچا پکایا درمیانہ سایا دے لیکن زندگی بھر خاص طور پر رمضان میں اگر وہ قرآن کی طرف متوجہ رہتا ہے تو اس کا حفظ ٹھیک ہوتا ہے۔ ایک تیسرا تجربہ ہے، ہمارے ہاں بھی اس پر عمل ہو رہا ہے، اور بھی کئی جگہ پر اس پر عمل ہو رہا ہے۔ وہ یہ کہ وہ بچہ داخل کیا جائے جو پرائمری پاس ہو یعنی ابتدا میں بچہ ناظرہ پڑھنے کے لیے مسجد میں بے شک جائے، لیکن حفظ کے لیے مدرسے میں قاری صاحب کے حوالے کرنے کی بجائے وہ روٹین میں اسکول ہی جائے، ابتدا میں ہم نے رعایت رکھی تھی کہ اساتذہ کے بچوں کو ہم ابتدا ہی سے حفظ میں داخل کر لیتے تھے اور ایک استاد ان بچوں کے لیے مقرر کر دیتا تھا، لیکن وہ تجربہ بھی اتنا کامیاب نہیں ہوا۔ اب ہم اپنے اساتذہ کو بھی کہتے ہیں کہ اپنے بچوں کو پرائمری تک اسکول میں پڑھاؤ۔

اس کے مختلف اسباب ہیں جن میں سے ایک تو یہ کہ قاری صاحب کی درس گاہ میں جو جلال کا غلبہ ہوتا ہے، چھوٹے بچے کے لیے وہ ماحول شاید اتنا زیادہ سازگار نہ ہو۔ دوسرے ماحول میں وقت گزار کر آئے گا تو بہت سی چیزیں سیکھا ہوا ہوگا اور ان پر محنت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ دوسرا یہ کہ اتنے چھوٹے بچے کی لرننگ کی رفتار سست ہوتی ہے، اس کی سست رفتاری کو اپنے یا قاری صاحب کے ذمہ ڈالنے کی بجائے ابتدائی تعلیم اسکول میں عام ماحول میں ہی ہوتی بہتر ہے۔ بچہ پانچویں پڑھ چکا ہوگا تو اس کو حروف کی شناخت ہو چکی ہوتی ہے، سمجھ دار ہو چکا ہوتا ہے، وہ اڑھائی تین سالوں میں حفظ مکمل کر سکتا ہے۔ اس کی بہت ساری مثالیں ہیں بلکہ ایک سال میں حفظ کرنے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ کرتے ہیں اور بہت ساری جگہوں پر یہ ہو رہا ہے کہ چھٹی، ساتویں، آٹھویں کے مشکل مضامین تھوڑے تھوڑے کر کے ساتھ پڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ بچہ جب حفظ سے فارغ ہوتا ہے تو تھوڑی سی ٹیوشن پڑھ کر مڈل کا امتحان دے لیتا ہے۔ اس کے بعد پھر اس کے لیے آگے راستہ کھلا ہوتا ہے۔

اس سے اوپر کی تعلیم میں کئی مقاصد پیش نظر ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ عصری تعلیم کی ایسی سند موجود ہو جو سرکاری طور پر مسلمہ ہو۔ اس سے دینی مدرسے کے فارغ التحصیل کے لیے یونیورسٹیز میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے راستے کھل جائیں گے اور الحمد للہ جب سے یہ راستے کھلے ہیں، اس کے بہت سارے اچھے فوائد اور ثمرات نظر آئے ہیں۔ دوسری چیز یہ پیش نظر ہوتی ہے کہ ہمارے مدارس اور مساجد میں شاید افراد کے کھپانے کی اتنی گنجائش نہیں ہے جتنی بڑی تعداد دینی مدارس سے الحمد للہ فارغ ہو رہی ہے۔ جو فارغ التحصیل، ہیں ان کے لیے روزگار کے مواقع ہونے چاہئیں تو اس حوالے سے بھی عصری تعلیم کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ یہ تعلیم روزگار میں کتنی کارگر ہے، یہ ایک الگ بحث ہے، لیکن بہر حال یہ سوچ ذہن میں ہوتی ضرور ہے۔

اس سلسلے میں ایک مستقل مجلس الشریعہ اکادمی میں ہو چکی ہے کہ فضلاء کرام کے معاشی مسائل کا حل کیا ہو؟ اس سلسلے میں، میں یہ عرض کروں گا یہ صرف ہماری تعلیم ہی کا مسئلہ نہیں ہے، ہماری جو مین اسٹریٹس میں ہے، اس میں بھی یہ مسئلہ ہے کہ صرف نوکری کرنا سکھلایا جاتا ہے، اس کے علاوہ بچے کو اور کچھ نہیں سکھایا جاتا، حالانکہ تھوڑا سا بزنس مائنڈ بنانا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ایک فارغ التحصیل عالم نے کسی اور لائن میں جانا ہی ہے تو اگر وہ کچھ بزنس مائنڈ ہوگا تو بجائے اس کے کہ وہ کسی سے روزگار مانگے، وہ روزگار دینے والا بن جائے گا۔ اس کے علاوہ عصری تعلیم سے متعلق کچھ خالص دینی مقاصد بھی ہوتے ہیں اور یہ جتنی بھی بحثیں ہیں، اصل مقصد ضرور ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے۔ اصل مقصد وہ تبحر، عمیق علم رکھنے والے، رسوخ فی العلم رکھنے والے علماء پیدا کرنا ہے جو ہر زمانے کے مطابق لوگوں کو اللہ کی طرف، اللہ کے رسول کی طرف بلا سکیں اور دینی امور میں لوگوں کی رہنمائی کر سکیں۔ یہ ایک مستقل مقصد ہے اور اس کے لیے الگ انداز سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ محض کوئی سند یا ڈگری حاصل کر لینا شاید اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس دور کے جو چیلنجز ہیں، کچھ کلامی نوعیت کے ہیں، کچھ فقہی اور قانونی نوعیت کے ہیں، سماجی اور معاشرتی نوعیت کے ہیں، معاشی نوعیت کے ہیں، دعوتی نوعیت کے ہیں۔ ہر ایک کو سامنے رکھ کر اس کے حساب سے الگ سے تعلیم کا بندوبست کرنے کی ضرورت ہے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد بہت سارے مدارس ایسے ہیں جن میں اولیٰ کے سال کو دو حصوں میں تقسیم کر کے باقاعدہ میٹرک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ کافی حد تک اچھا اور کامیاب تجربہ ہے، لیکن میری معلومات کی حد تک اس میں دو تین مسائل پیش آرہے ہیں۔ ایک مسئلہ تو وہی ہے جس کا حضرت مولانا مفتی حامد حسن صاحب نے ذکر فرمایا تھا کہ ایک استاد رکھا تو اس کے نتیجے میں طلباء چلے گئے۔ اپنا استاد ہو تو یہ مسئلہ ذرا کم ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اس وجہ سے ہے کہ گھر والے بچے کو یہ سوچ کر مدرسے میں بھیجتے ہیں کہ یہ کوئی زیادہ صلاحیت رکھنے والا بچہ نہیں ہے، لیکن یہاں چونکہ وہ چوبیس گھنٹے ہماری نگرانی میں ہوتا ہے، محنت کرتا ہے، پڑھتا ہے، اس کی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے تو وہ میٹرک میں بہت اچھے نمبر لے لیتا ہے اور بعض اوقات والدین کی توقعات سے بہت بڑھ کر نمبر لے لیتا ہے تو والدین کا ذہن دوسری طرف چلنا شروع ہو جاتا ہے کہ اچھا! ہمیں تو اب پتہ چلا کہ ہمارا بچہ ذہین ہے۔ اگر یہ ذہین ہے تو اسے ایف ایس سی کرانی چاہیے، اس کو کسی اور طرف لگانا چاہیے۔ اگرچہ یہ بچہ ابتداء میں مدرسے میں پڑھ کر کسی اور طرف بھی چلا گیا تو دین کی جو بنیاد اس کے اندر پڑ گئی ہے، وہ ان شاء اللہ اس کے ساتھ رہے گی، لیکن پھر بھی ہم نے اس پر محنت کی ہے، ہمارے ہی کام آئے اور آخر تک ہمارے پاس ہی پڑھے، یہ ہمارا ایک مقصد ہو سکتا ہے۔ تو اس میں اگر ہمارے اپنے اساتذہ ہوں، وہ ترغیب سے کام لیں تو اس مسئلے کو حل کیا جاسکتا ہے۔

دوسرے ایک چیز محسوس کی گئی ہے، ہمارا اپنا ذاتی تجربہ بھی ہے کہ آپ اولیٰ میں عربی زبان کے قواعد پڑھاتے ہیں یا اسے دو سالوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، اگرچہ دورانہ اتنا ہی ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود قواعد میں، صرف و نحو میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور رہ جاتی ہے۔ یہ قابل غور ہے اور اس کا حل ہونا چاہیے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی سال

کا اختتام شعبان کے آخر میں ہوتا تھا۔ پچیس شعبان کے لگ بھگ امتحان ہوتے تھے۔ دینی مدارس میں تعلیمی سال چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ شعبان کا پہلا ہفتہ امتحان کا ہوتا تھا، اب رجب کے آخری ہفتہ بلکہ آخری عشرہ کی طرف آنے لگ گئے ہیں، اور دوسری طرف بعض مدارس میں تعلیم کا آغاز بھی ذرا دیر سے ہوتا ہے۔ تو تعلیمی سال کو دوبارہ بڑھانے کی طرف توجہ دیں تو اس مسئلے کو حل کیا جاسکتا ہے۔ ہم نے ایک تجربہ یہ بھی کیا کہ اولیٰ میں جو میٹرک والے طلبہ ہیں، ان کو ہم رمضان سے ایک دو دن پہلے چھٹی دیں، لیکن باقی مدرسے میں چھٹی ہو چکی ہوتی ہے۔ چند ایک کو رجب رکھتے ہیں تو وہ ایک نیا ماحول محسوس کرتے ہیں، اس میں ان کا دل پوری طرح لگانا، ان کو پڑھائی پر لگانا بھی اچھا خاصا کام ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم جس لیول پر بھی ہو، ایک اہم مسئلہ تاریخوں کا clash ہوتا ہے، انہی تاریخوں میں بورڈ کے امتحان ہو رہے ہوتے ہیں، انہی تاریخوں میں وفاق کے امتحان ہو رہے ہوتے ہیں۔ قمری و شمسی حساب کی وجہ سے بعض اوقات تاریخیں تقریباً کٹھی ہو جاتی ہیں۔

میٹرک کے بعد میرے علم کے مطابق تین ماڈلز چل رہے ہیں۔ ایک یہ کہ میٹرک کر کے طالب علم دورہ حدیث تک اب اپنے آپ کو روک کر رکھے، اس دوران مزید کسی اور طرف توجہ نہ دے۔ بہت ساری جگہوں پر یہ ماڈل رو بہ عمل ہے اور اس کے اپنے فوائد، اثرات اور نتائج ہیں۔ دوسرا ماڈل ہے کہ عصری تعلیم کو باقاعدہ اپنے نظام کا حصہ بنا لیا جائے، وہاڑی میں جامعہ خالد بن ولید میں، جامعہ الرشید میں، اسلام آباد کے اندر مولانا فیض الرحمن عثمانی کے ہاں، جامعہ حنفیہ بورے والا میں ایسا ہی ہے اور اس طرح کی کئی اور مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں۔ تیسرا ماڈل یہ ہے کہ ادارہ اپنی طرف سے کوئی اس طرح کا انتظام نہیں کرتا، لیکن طلبہ کو مشروط طور پر اجازت دے دیتا ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں جامعہ امدادیہ میں گذشتہ سال کی حاضر یوں کا ریکارڈ دیکھا جاتا ہے، گزشتہ تعلیمی سال میں امتحانات میں نمبروں کی ایک مخصوص حد متعین کی جاتی ہے تاکہ پتہ چلے کہ اس تعلیم میں توجہ کیسی ہے اور ایک یہ کہ چھٹی جو ملے گی، وہ صرف امتحان دینے کی ملے گی، تیاری کا زیادہ حصہ شعبان رمضان کی یادگیر چھٹیوں میں مکمل کرنا ہوگا۔

لیکن ان تینوں ماڈلز میں بھی مسائل و مشکلات ہیں۔ ممانعت والے میں یہ ہے کہ دورہ حدیث کے بعد اس گپ کو اگر طالب علم کو کرنا چاہے تو سال زیادہ لگتے ہیں اور کسی جگہ سیٹل ہونے میں وقت زیادہ لگ جاتا ہے۔ عمر کا مسئلہ بھی اس میں آ جاتا ہے۔ اپنے طور پر تیاری کے ماڈل میں ایک مشکل یہ پیش آرہی ہے کہ بچے چھٹیوں کے دوران اپنے گھروں میں کسی استاد سے تیاری کر رہے ہوتے ہیں یا تعلیم کے ساتھ ہی عصر کے بعد یا کسی اور وقت اپنے طور پر کسی کے پاس جا کر تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ دو قسم کی تیاریوں میں یکسانیت بعض اوقات نہیں ہوتی، اس سے تیاری کے سلسلے میں طالب علم کے ذہن پر اضافی بوجھ پڑتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک بالکل مختلف ماحول میں کچھ دیر کے لیے طالب علم کو جانا پڑتا ہے۔ اصل ضرورت اس چیز کی ہے کہ بحیثیت مجموعی پورے سسٹم اور پورے نظام پر طویل اور وسیع پیمانے پر مشاورت ہو اور وسیع غور و فکر ہو۔

اس کی دو جہتیں ہیں۔ ایک تو مدارس، وفاق ہائے مدارس، تنظیمات ہائے مدارس کی سطح پر۔ اگر ہم اپنی پہلی

ٹرمنا لوجی کو دیکھیں تو دینیات اور درسیات کے الگ الگ حصے ہوتے تھے۔ جس طرح آج کل عصری تعلیم کے بارے میں یہ ہے کہ یہ تدین کے حوالے سے برے اثرات پیدا کرے گی، بعینہ یہی تحفظات پہلے بزرگوں کے ملفوظات میں درسیات، مثلاً منطق و فلسفہ کے متعلق ملتے ہیں، کیونکہ یہ اس دور کے عصری علوم تھے۔ مثلاً حضرت مولانا خیر محمد صاحب کے بارے میں حضرت والد صاحب سے سنا کہ ان کا ذوق یہ تھا کہ مشکوٰۃ اور دورہ حدیث سے پہلے جو درسیات پڑھنی ہیں، شمس بازغہ اور ملا صدرا وغیرہ، پڑھ لو، تا کہ اس کے اوپر جو تہہ لگے، وہ علم حدیث کی لگے اور جو برے اثرات ہو سکتے ہیں، ان کا حدیث کے ذریعے سے ازالہ ہو جائے۔ وہ تحفظات وہاں بھی تھے جو آج عصری علوم میں ہیں، لیکن ان چیزوں کو نظام کا حصہ بنایا گیا۔ جو چیزیں ہم لے کر چل رہے ہیں، ان میں جو غیر ضروری چیزیں ہوں، ان میں کمی کر کے ان کی جگہ پر ضروری چیزوں کو شامل کر لیں۔ بہر حال، ہم عملی طور پر دو الگ الگ نظام ہائے تعلیم کی پیوند کاری کر رہے ہوتے ہیں، بلکہ ہم کیا کر رہے ہوتے ہیں، طالب علم اپنے طور پر کر رہا ہوتا ہے جس سے وہ ایک عجیب سا ملعوبہ سا بن جاتا ہے۔ اگر مدارس از خود اس پر جامع مشاورت کر کے ایک جامع نظام بنالیں تو اس سے طلباء کے لیے آسانی بھی ہو جائے گی اور نتائج بھی بہتر سامنے آنے کی توقع ہے۔

اس مشاورت کا دوسرا پہلو سرکاری سطح پر ہے، کیونکہ بہت سارے مقاصد اس چیز پر منحصر ہیں کہ جو سند بھی ہمارے بچے کے پاس ہے، وہ سرکاری طور پر تسلیم شدہ ہو۔ مدارس کی اسناد کا اعتراف کیسے کرنا ہے؟ کن بنیادوں پر کرنا ہے؟ اس کے لیے فی الحال میری ناقص معلومات کے مطابق کوئی قانون موجود نہیں ہے، چند ایک نوٹیفیکیشنز ہیں اور بس۔ ایک جامع قانون سازی کی ضرورت ہے اور اس قانون سازی کے پیچھے جتنے بھی اسٹیک ہولڈرز ہیں، وفاق ہوں، مدارس ہوں، مدارس کے فضلاء ہوں، جہاں ان فضلاء نے کھینا ہوتا ہے، وہ لوگ ہوں، جہاں ان فضلاء نے داخلہ لینا ہوتا ہے، وہ ادارے ہوں یا سوسائٹی کے سرکردہ لوگ ہوں، پہلے تو اس پر وسیع مباحثہ ہونا چاہیے اور اس کے بعد ضرورت کے مطابق ایک جامع قانون سازی کی جانی چاہیے۔ خاص طور پر دو بڑے اہم مسئلے آئندہ آرہے ہیں اور وہ ہمارے لیے مسائل پیدا کریں گے۔ ایک تو یہ کہ اب تک گریجویٹیشن دو سالہ ہے، دو سال میں بی اے ہو جاتی ہے، لیکن ممکن ہے کہ پوری دنیا کے ٹرینڈ کے مطابق چار سالہ گریجویٹیشن ہو جائے۔ اس سے یہ اپنے طور پر چلنے والا سلسلہ بھانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس کے لیے ایک پورے سسٹم کی اور وسیع اور گہرے غور و خوض کی ضرورت ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ یونیورسٹی لیول کی تعلیم میں پرائیویٹ تعلیم کا تصور اگر ختم ہو گیا تو بھی مسائل پیدا ہوں گے۔ آنے والے وقت میں ہمارا اجزل تعلیمی رجحان اور دنیا کا رجحان کس طرف جارہا ہوگا، ہماری ملک کی عمومی تعلیم کدھر جارہی ہوگی، اس کا صحیح اندازہ لگا کر بروقت سوچنا ہماری ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس بیٹھنے کی برکت سے مزید راہیں کھولیں۔ آمین

# موجودہ دور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات

۲۳ جنوری ۲۰۱۸ء کو مجلس صوت الاسلام کلغٹن کراچی میں علماء کرام کی ایک نشست سے خطاب کا خلاصہ

بعد الحمد والصلوة۔ آج ہماری گفتگو کا عنوان ہے کہ ایک مسلمان ریاست میں غیر مسلموں کے کیا حقوق و مسائل ہیں اور کسی غیر مسلم ریاست میں رہنے والے مسلمانوں کے معاملات کی نوعیت کیا ہے؟ ہمارے ہاں جب پاکستان، بنگلہ دیش، بھارت اور برما سمیت یہ خطہ، جو برصغیر کہلاتا ہے، متحد تھا اور مسلمانوں کی حکمرانی تھی تو اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں فقہی بحث و مباحثہ اس قسم کے عنوانات سے ہوتا تھا کہ یہاں رہنے والے ذمی ہیں یا معاہدہ ہیں، اور یہاں کی زمینیں عشری ہیں یا خراجی ہیں۔ اس علاقہ میں اسلام مجاہدین کی جنگوں کے ذریعے بھی آیا ہے، صوفیاء کرام کی دعوت و اصلاح کی محنت سے بھی آیا ہے اور تاجروں کی آمد و رفت بھی فروغ اسلام کا ذریعہ بنی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جہاد کے ذریعے مغلوب ہونے والے لوگوں اور علاقوں کی حیثیت از خود مسلمان ہو جانے والے لوگوں اور علاقوں سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے اس حوالہ سے یہاں ہمارے فقہی مباحث کا ایک وسیع دائرہ ماضی کے علمی ذخیرہ میں ملتا ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دس سالہ مدنی دور میں ہمیں اس سلسلہ میں مختلف صورتیں دکھائی دیتی ہیں: ریاست مدینہ جنگ اور غلبہ کے ذریعے قائم نہیں ہوئی تھی بلکہ قبائل کے ساتھ مسلسل گفتگو اور مذاکرات کے ذریعے وجود میں آئی تھی جس میں یہودی اور دیگر غیر مسلم قبائل بھی شامل تھے اور ”میثاق مدینہ“ ایک باہمی معاہدہ کی صورت میں اس ریاست کے دستور کی حیثیت رکھتا تھا۔

خیبر اور بہت سے دیگر علاقے جنگ اور جہاد کے ذریعے اس ریاست میں شامل ہوئے تھے۔

یمن کے بیشتر قبائل خود مسلمان ہوئے تھے جس کے نتیجے میں یمن ریاست مدینہ کا حصہ بن گیا تھا۔

نجران کے عیسائی ایک معاہدہ کے تحت ریاست مدینہ کا حصہ بنے تھے۔

چنانچہ دور نبوی کی انہی مثالوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک مسلمان ریاست کا حصہ بننے والے خطوں اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں فقہاء کرام نے الگ الگ فقہی ابواب و احکام مرتب فرمائے اور متحدہ ہندوستان پر مسلمانوں کے اقتدار کے دور میں بھی بحث و مباحثہ کا یہ تنوع موجود رہا جس کی ایک مثال یہاں کی زمین کے عشری یا خراجی ہونے کی

بحث میں ملتی ہے۔ لیکن جب برصغیر پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو جانے کے بعد دہلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا انتظامی و مالیاتی کنٹرول قائم ہونے پر حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا اور اہل علم کے عمومی حلقوں میں اس فتویٰ کو قبول کر لیا گیا جس کے نتیجے میں فرنگی اقتدار کے خلاف مسلح جنگوں کا وسیع سلسلہ شروع ہو گیا تو میری طالب علمانہ رائے میں یہ سارے فقہی مباحث ماضی کا حصہ بن گئے تھے اور اس پورے خطہ کی شرعی حیثیت یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔ اس سے قبل اس علاقہ میں مسلمان غالب اور غیر مسلم مغلوب تھے جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری قائم ہونے کے بعد یہ پہلے کے غالب و مغلوب دونوں مغلوب ہو گئے تھے اور دونوں نے مل کر اس نئے غلبہ کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ اب ان کے درمیان غالب اور مغلوب کا تعلق نہیں رہا تھا بلکہ مستقبل کے معاملات میں یہ باہمی شریک کار بن گئے تھے اور اس طرح ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا جسے شرعی اور فقہی حوالہ سے نئی صورتحال کے طور پر دیکھنا ضروری ہے۔ یہ میری طالب علمانہ رائے ہے جس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ جنگ آزادی اور اس کے بعد کے معاملات کے حوالہ سے اس خطہ کے مسلم اور غیر مسلم دونوں باہمی معاہدہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے باہمی معاملات کو ان معاہدات کے دائرہ میں دیکھنا ہوگا جو حضرت شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ کے بعد جنگ آزادی میں یہاں کی مسلم اور غیر مسلم اقوام کے درمیان باہمی اشتراک عمل کی صورت میں وجود میں آئے تھے اور خاموش معاہدات ہی آئندہ کے سارے معاملات کی بنیاد بننے ہیں۔

اس پس منظر میں پاکستان بننے کے بعد اس ریاست کے تمام غیر مسلم طبقوں کی حیثیت معاہدین کی بنتی ہے اور ان پر ذمی کا اطلاق درست معلوم نہیں ہوتا اس لیے کہ جنگ آزادی اور تحریک پاکستان میں یہ سب باہم شریک کار تھے جبکہ پاکستان کے قیام کے بعد ”دستور پاکستان“ کی صورت میں ہمارے درمیان ایک سماجی معاہدہ تشکیل پا چکا ہے۔ اس لیے جو غیر مسلم حلقے پاکستان کے شہری کے طور پر دستور پاکستان کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کی پابندی کا عہد کرتے ہیں، وہ ہمارے معاہدین ہیں اور ان کے ساتھ دستور میں ہمارے جو معاملات طے پائے ہیں، ان کی پابندی کرنا اور دستور کے مطابق وطن عزیز کے غیر مسلم باشندوں کو ان کے حقوق ادا کرنا بلکہ ان کی پاسداری کرنا ہماری قومی اور شرعی ذمہ داری قرار پاتی ہے۔ البتہ قادیانیوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے، اس لیے کہ وہ اس دستوری معاہدہ کو تسلیم نہیں کر رہے اور اس سے مسلسل انکاری ہیں۔ چنانچہ جب تک وہ ملک کی دیگر غیر مسلم آبادیوں کی طرح دستور پاکستان کو تسلیم نہیں کرتے اور اس پر عملدرآمد کی ضمانت نہیں دیتے، انہیں دوسری غیر مسلم آبادیوں کی طرح برابر کے حقوق نہیں دیے جاسکتے۔

یہ تو ایک مسلم ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کی بات ہے جس کے بارے میں پاکستان کے تناظر میں ہم نے چند گزارشات پیش کی ہیں۔ اب ہم مسئلہ کے دوسرے پہلو کی طرف آتے ہیں کہ غیر مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کو وہاں کس طرح رہنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ہم اپنی معروضات کو درج ذیل دائروں میں پیش کریں گے:

- امریکہ، برطانیہ اور فرانس سمیت دیگر غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد رہتی ہے جو وہاں ایک معاہدے کے تحت گئے ہیں جس کے ذریعے انہیں وہاں کا ویزا اور رہنے کی اجازت ملی ہے، انہیں اس معاہدہ کی پابندی کرنی چاہیے۔

- غیر مسلم ممالک میں رہتے ہوئے اپنے عقیدہ و ایمان، شرعی فرائض و واجبات کی ادائیگی اور اپنی اگلی نسل کے ایمان و اعمال کی حفاظت کا اہتمام کرنا مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے۔ اس لیے اگر کسی غیر مسلم ماحول میں وہ اپنے دینی فرائض و احکام پر عمل نہیں کر سکتے یا اپنی نئی نسل کے ایمان و عقیدہ اور دین سے وابستگی برقرار رہنے سے مطمئن نہیں ہیں تو ان کا اس ماحول میں رہنے کا شرعی جواز باقی نہیں رہے گا۔

- مسلمانوں کو وہاں کے اجتماعی نظام میں شرکت کے مواقع کو استعمال کرنا چاہیے بلکہ ایسے مواقع تلاش کر کے ان سے استفادہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ اسی صورت میں وہاں کے نظام و ماحول میں مسلمانوں کے حقوق و مفادات کا تحفظ کر سکتے ہیں اور مسلمانوں کے لیے باوقار زندگی کی صورتیں مہیا کر سکتے ہیں۔

- ان غیر مسلم ممالک کے قانون و دستور کے دائرے میں رہتے ہوئے اگر اپنے شرعی احکام و قوانین کے نفاذ کے لیے کوئی قانونی سہولت میسر ہو تو اسے ضرور استعمال کرنا چاہیے۔ جیسا کہ امریکہ، جنوبی افریقہ اور دیگر ممالک کے دستور و قانون میں مسلمانوں کے لیے نکاح و طلاق اور دیگر خاندانی معاملات میں باہمی تنازعات کا شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے شرعی عدالتوں کے قیام کی گنجائش موجود ہے اور وہاں کے مسلمان اس سے کسی حد تک استفادہ بھی کر رہے ہیں۔

- اور آخری بات یہ عرض ہے کہ کسی غیر مسلم معاشرہ میں رہنے والے مسلمان وہاں اسلام کے سفیر کی حیثیت رکھتے ہیں، انہیں وہاں کے ماحول کے مطابق اسلام کی دعوت و تبلیغ کا کوئی مؤثر طریق کار ضرور اختیار کرنا چاہیے۔

### تکفیر کی اتھارٹی، علماء یا حکومت؟

ایک سوال ان دنوں کم و بیش ہر جگہ پوچھا جا رہا ہے کہ کیا ”پیغام پاکستان“ کے ذریعے کفر کے فتوے کی اتھارٹی اب حکومت و عدالت کو منتقل ہو گئی ہے؟ اور اگر ایسا ہو گیا ہے تو مفتیان کرام کا اس میں کیا کردار باقی رہ گیا ہے؟ اس سلسلہ میں اپنا ذاتی نقطہ نظر پیش کر رہا ہوں جسے من و عن قبول کرنا ضروری نہیں ہے البتہ اس کے بارے میں اہل علم و دانش سے سنجیدہ توجہ اور غور و خوض کی درخواست ضرور کروں گا۔ یہ سوال اس سے قبل ہمارے سامنے اس وقت بھی آیا تھا جب بنگلہ دیش کی قومی اسمبلی میں یہ تحریک پیش کی گئی تھی کہ بنگلہ دیش میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ وہاں کے قادیانی حلقوں نے بڑے شد و مد کے ساتھ یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا کسی کو مسلمان یا کافر قرار دینا اسمبلیوں کا کام ہوتا ہے یا یہ ذمہ داری اہل علم و فتویٰ کی ہے؟ بنگلہ دیش کے بعض علماء کرام نے سفیر ختم نبوت حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی سے اس سلسلہ میں رجوع کر کے راہنمائی طلب کی تھی جس پر مولانا چنیوٹی نے بہت سے دیگر علماء کرام کے علاوہ مجھ سے بھی مشورہ کیا تھا اور میری اس گزارش سے اتفاق کیا تھا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم ہونے کی شرعی حیثیت تو علماء کرام نے واضح کر دی ہے اور سب اہل علم کا اس سے اتفاق ہے، مگر اسے عملی قانون کا حصہ بنانے اور اس کے معاشرتی اطلاق و تصفیہ کے لیے پارلیمنٹ سے مطالبہ کیا جا رہا ہے، کیونکہ کسی معاملہ کے سوسائٹی پر اطلاق اور اس کی عملی تصفیہ کی اتھارٹی بہر حال حکومت وقت کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے جب پاکستان کی حکومت اور پارلیمنٹ سے

قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت کا درجہ دینے کا مطالبہ کیا تھا تو وہ مطالبہ یہ نہیں تھا کہ پارلیمنٹ قادیانیوں کو کافر قرار دینے کا فتویٰ صادر کرے، بلکہ یہ تھا کہ چونکہ اس گروہ کو پوری امت مسلمہ غیر مسلم قرار دے چکی ہے، اس لیے قانون و دستور میں بھی ان کی یہ حیثیت تسلیم کی جائے۔

میرے خیال میں وہی سوال اب مذکورہ صورت میں ہمارے سامنے آ گیا ہے کہ کفر و اسلام کی بحث تو اہل علم و افتاء کا کام ہوتا ہے، اس میں حکومت یا پارلیمنٹ کو اتھارٹی کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ میری طالب علمانہ رائے میں کسی فرد یا گروہ کے کفر یا اسلام کو واضح کرنا تو بہر حال اہل علم و فتویٰ ہی کی ذمہ داری بنتی ہے مگر اس کی عملی تطبیق اور معاشرتی اطلاق کی اتھارٹی عدالت، پارلیمنٹ یا حکومت کے پاس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے بعد ان کے بارے میں اس اجتماعی فیصلے پر عملدرآمد کے لیے عدالت، حکومت اور پارلیمنٹ سے رجوع کیا تھا۔ قیام پاکستان سے قبل اس مقصد کے لیے ریاست بہاولپور کی عدالت کے سامنے حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کاشمیری، حضرت علامہ غلام محمد گھوٹوی اور دیگر اکابر علماء کرام کا پیش ہونا اور اس سے فیصلہ طلب کرنا اسی مقصد کے لیے تھا، جبکہ اسی ناگزیر ضرورت کے تحت قیام پاکستان کے بعد قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ حکومت وقت سے کیا گیا تھا جو ۱۹۷۷ء میں ایک دستوری بل کی صورت میں منتخب پارلیمنٹ کے سامنے رکھا گیا تھا اور اس کے بعد یہ معاملہ وفاقی شرعی عدالت اور عدالت عظمیٰ کے سامنے بھی پیش ہوا تھا۔ یہ سارے مراحل اس امر کی توثیق کرتے ہیں کہ کسی فتویٰ کا عملی اطلاق اور اس کی معاشرتی تنفیذ حکومت و عدالت ہی کی ذمہ داری بنتی ہے۔

اس کی ایک مثال یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی قانونی یا دستوری مسئلہ پر حکومتی رائے وہ ہوتی ہے جو انٹرنی جنرل، ایڈووکیٹ جنرل یا ڈسٹرکٹ انٹرنی پیش کرتے ہیں، لیکن اسے قانونی فیصلے کی حیثیت متعلقہ عدالت کے حکم سے حاصل ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ باقاعدہ قانونی صورت اختیار کرتی ہے۔ ایک حد تک اس معاملہ کو اس فقہی قاعدہ کی صورت میں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ کسی کیس میں قاضی کا فیصلہ قانونی تقاضے تو پورے کر لیتا ہے جبکہ حقیقتاً وہ درست نہیں ہوتا حتیٰ کہ اس میں حلال و حرام کے معاملات بھی گڑبڑ ہو جاتے ہیں، تو ایسی بعض صورتوں میں فقہاء کرام یہ کہتے ہیں کہ وہ فیصلہ قضاء میں تو نافذ ہو جائے گا مگر دیانتاً نافذ نہیں ہوگا۔ دیانت اور قضا کے درمیان جو یہ فرق کیا جاتا ہے اس سے اتنی بات سمجھ میں آتی ہے کہ کسی مسئلہ کے عملی نفاذ و اطلاق کی صورت اس کی علمی و دینی حیثیت سے مختلف ہو سکتی ہے اور اس کا فقہی طور پر بھی اعتراف کیا جاتا ہے۔

میری یہ گزارشات ”پیغام پاکستان“ کی توضیح یا دفاع کے حوالہ سے نہیں بلکہ اس سے پیدا ہونے والے ایک سوال کے بارے میں فقہی صورتحال کے ایک پہلو کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہیں کہ کسی فرد، طبقہ یا گروہ کے مسلمان یا کافر ہونے کی بحث و فیصلہ تو اصولی طور پر اہل علم و فقہ کا کام ہے مگر اس کی معاشرتی تنفیذ اور قانونی اطلاق متعلقہ اور مسلمہ اداروں کے ذریعے ہی قابل عمل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب ہم کسی مسئلہ کی شرعی پوزیشن کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اس کے عملی اطلاق اور معاشرتی تنفیذ کے معاملات بھی اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتے ہیں تو اس سے بہر حال کنفیوژن پیدا ہوتا ہے، جبکہ ان دونوں معاملات کو الگ الگ رکھا جائے تو اس قسم کی الجھنوں سے بچا جاسکتا ہے۔

### پیغام پاکستان: پس منظر اور پیش منظر

دہشت گردی کے خلاف علماء کرام نے ”پیغام پاکستان“ کے نام سے کتابی شکل میں ایک متفقہ فتویٰ صادر کیا ہے جس پر 1800 سے زائد علماء کے دستخط ہیں۔ اس کتابچے کو ادارہ تحقیقات اسلامی نے شائع کیا ہے۔ اس کا قومی بیانیے کے حوالے سے اجراء صدر پاکستان کی سربراہی میں علماء کرام اور حکومتی نمائندہ شخصیات کی موجودگی میں اسلام آباد میں منعقدہ ایک کانفرنس میں ہوا۔ اس فتویٰ میں دہشت گردی، خونریزی، خودکش حملوں اور ریاست کے خلاف مسلح جدوجہد کو، خواہ وہ کسی نام یا مقصد سے ہو، حرام قرار دیا گیا ہے اور ان چیزوں سے کیسے نمٹنا جائے، اس حوالے سے علماء کرام کی تجاویز ہیں۔ اس فتویٰ کی اہمیت کے لیے یہ کافی ہے کہ اس کو تمام مسالک کے علماء و مفتیان کرام کی ایک بڑی تعداد نے منعقدہ طور پر منظور کیا ہے اور پھر ریاست نے اس کو قومی بیانیہ قرار دے دیا ہے۔

پاکستان میں گزشتہ کئی سالوں سے نادرست خارجہ پالیسیوں یا کچھ عناصر کے بے لگام ہونے کی وجہ سے بد امنی اور انتشار کی کیفیت تھی۔ مشرف حکومت کے بعد دہشت گردی اور بد امنی میں مزید اضافہ ہوا۔ دہشت گردی، بد امنی اور انتشار کی اس کیفیت نے ملک عزیز کی سلامتی کو داؤ پر لگا رکھا تھا، پاکستان کی معیشت ہچکولے کھا رہی تھی، بہت سی قیمتی جانوں کا نقصان ہو چکا تھا۔ ملک میں داخلی سطح پر جو کیفیت تھی سو تھی، عالمی طور پر پاکستان کا منہج خراب ہو چکا تھا، اور ہمارے ہمسایے ہمیں آڑے ہاتھوں لے رہے تھے۔ انہی حالات میں ایک دل دہلا دینے والا واقعہ پیش آیا۔ یہ واقعہ آرمی پبلک اسکول میں ڈیڑھ سو کے قریب بچوں، اساتذہ اور دیگر عملے کی شہادت کا تھا۔ ننھی اور معصوم کلیوں کی شہادت کے درد کو پوری قوم نے محسوس کیا اور اس المناک حادثہ نے پوری قوم کو دہشت گردی کے خلاف ایک صف میں لاکھڑا کیا۔ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے اور اس کو شکست دینے کے لیے پوری قوم مضبوط و آہنی عزم کے ساتھ متحد ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ درحقیقت ملک عزیز کو درپیش چیلنجز سے نمٹنے کے لیے ایسے ہی اتفاق و اتحاد کی ضرورت تھی۔

اس واقعہ کے بعد دہشت گردوں اور ان کے سہولت کاروں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کے لیے ریاست نے نیشنل ایکشن پلان ترتیب دیا، دہشت گردوں کی کمر توڑنے کے لیے مختلف آپریشن کیے گئے، بیٹکوں میں اکاؤنٹس کی چھان بین کی گئی، سموں اور شناختی کارڈز کی رجسٹریشن کا نظام سخت کر دیا گیا، میڈیا و سوشل میڈیا کی کڑی نگرانی کی گئی، اور انسداد

\* استاذ مدرسۃ الشریعہ، الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

دہشت گردی کے ادارہ ہیکٹا کو مضبوط کیا گیا۔ ان تمام عملی کاموں کے ساتھ دہشت گردوں کا نظری سطح پر بھی مقابلہ کیا گیا۔ اس ضمن میں علماء کرام کی خدمات نہایت وقیح ہیں۔ علماء کرام نے دہشت گردی کے خلاف فتاویٰ اور بیانیے صادر کیے، دہشتگردوں کا نظری سہارا ختم کرنے کے لیے ان آیات، احادیث اور عبارات کے جواب دیے جن کو وہ استعمال کر رہے تھے، ان نصوص کی درست تعبیرات و محل کو امت کے سامنے واضح کیا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امن پسند علماء کرام کو اپنے فتاویٰ کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ اس جنگ میں بہت سے ممتاز علماء کرام کی شہادتیں ہوئیں۔ ان علماء کرام کی انفرادی کوششوں کے بعد اب یہ اجتماعی اور منفقہ فتویٰ بھی آچکا ہے جس کو قومی بیانیہ قرار دینا اور اس حوالے سے مزید کوششیں کرنا نہایت خوش آئند اقدام ہے۔

ہمارے ہاں مخصوص حالات اور خاص پس منظر میں کی جانے والی کوششیں صرف ان حالات سے نمٹنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ بلاشبہ عام طور پر کوئی بھی کوشش مخصوص حالات اور خاص پس منظر میں ہی شروع کی جاتی ہے، لیکن اس کو ایسی مستقل بنیادوں پر استوار کرنا کہ دوبارہ اس قسم کے حالات سے دوچار نہ ہونے پڑے، یہی اصل دانشمندی ہوتی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف ہماری کوششیں ہیں، انہیں بھی مستقل بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم وقتی امن کی بجائے مستقل اور پائیدار امن قائم کر سکیں اور نسل نو کو آگے بڑھنے کے اچھے مواقع فراہم کر سکیں۔

اس ضمن میں کیا کیا جاسکتا ہے، اس حوالے سے مختلف اہل علم اور صاحب قلم حضرات آرا دے رہے ہیں۔ میں بھی چند آرا دینا چاہوں گا۔

### فرقہ واریت کا خاتمہ:

دہشت گردی کو ختم کرنے کے لیے مختلف نوعیت کی محنت درکار ہے۔ ایک کوشش فرقہ واریت کو ختم کرنے کی ہے۔ فرقہ واریت سے مراد کسی بھی سطح پر ایسی گروہ بندی یا فرقہ بندی ہے جو دیگر گروہوں کے خلاف منفی جذبات کی تعبیر میں مصروف ہو اور شدت پسندی کو ابھار رہی ہو۔ ایسی گروہ بندی مذہبی، لسانی، صوبائی یا کسی بھی لحاظ سے ہو، اس کا قلع قمع کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہمیں ایک قوم بنانا ہے جس کی امنگیں، خواہشیں، ترجیحات اور مفادات یکساں ہوں۔ تبھی ہم ترقی کر سکتے ہیں اور اپنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

جو فرقے اور جماعتیں بن چکی ہیں، ان کو ختم کرنا تو شاید ممکن نہ ہو لیکن رواداری، احترام اور برداشت کے ذریعے ہم پر امن ماحول پیدا کر سکتے ہیں۔ فرقہ واریت میں چند چیزیں ایسی ہیں جن کو اگر ختم کرنے کی کوشش کی جائے تو فرقہ واریت کی شدت کم ہو سکتی ہے:

1۔ مختلف فرقوں کی کتابوں اور لٹریچر میں ایک دوسرے کے خلاف سخت فتاویٰ اور غیر مہذب اور اخلاق سے عاری الفاظ موجود ہیں۔ ان فتاویٰ پر شاید ان مسالک کو دل و جان سے حرز جان بنانے والے لوگ بھی نہ عمل کر پاتے ہوں، کیونکہ معاشرتی طور پر ایک دوسرے سے اتنا کٹ جانا کہ آدمی معاشرتی افعال خرید و فروخت، شراکت، تعلق داری اور دیگر معاملات میں صرف اپنے مسلک تک محدود ہو کر رہے، یہ عملی طور پر بہت مشکل کام ہے۔ اس قسم کے شدت پسندی

پر مبنی فتاویٰ اگرچہ عملی اور معاشرتی زندگی میں ناقابل عمل ہیں، لیکن نظری طور پر یہی فتاویٰ کسی بھی مسلک میں شدت پسندی اور دوسروں سے بغض و عداوت پیدا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہ نہ صرف موقع پرست علماء کے لیے بہترین ہتھیار ثابت ہوتے ہیں بلکہ جاہدہ اعتدال پر گامزن اور امن باہمی کی کوششیں کرنے والے علماء کے لیے بھی بہت بڑی رکاوٹ بنتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اب اس قسم کے عمر رسیدہ و سن یاس کو پہنچے ہوئے فتاویٰ کو ختم کر کے ان پر نظری تکیہ رکھنے والوں کا سہارا بھی ختم کیا جائے۔ اس زمرے میں کون سے فتاویٰ آتے ہیں، اس میں ہر مسلک کے معتدل و جید علماء و مفتیان کرام کی خدمات لی جاسکتی ہیں۔ اگر تمام مسالک کے معتدل علماء اس قسم کے فتاویٰ کو ختم کرنے میں متفق و متحد ہو جائیں تو رکھ میں دبی اس چنگاری سے جو کسی بھی وقت ہلاکت خیز آگ کا روپ دھاڑ سکتی ہے، ہم بچ سکتے ہیں۔

2- مولانا مودودی کی کتابوں میں مقدس شخصیات کے حوالے سے بعض ایسی باتیں تھیں جو بظاہر نظر دیکھنے سے خلاف ادب معلوم ہوتی ہیں اور دینی حمیت رکھنے والے کسی بھی شخص کے لیے ناقابل برداشت ہیں۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے مقدس شخصیات کے بارے میں ہمارے جذبات ایسے ہی ہونے چاہئیں، لیکن ان جذبات کو اگر ہم دائرہ قانون میں لے آئیں تو شاید اس قسم کے مسائل زیادہ احسن طریقے سے حل ہو سکیں گے۔ مولانا مودودی کی کتابوں سے قاضی حسین احمد صاحب نے اس قسم کا مواد ہٹا دیا۔ قاضی صاحب عبقری شخصیت کے مالک تھے، ان کے دیگر سیاسی و مذہبی کارناموں کے ساتھ یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ جماعت کے اندر سے بہت سے لوگوں نے اس کی سخت مخالفت کی، لیکن قاضی صاحب اپنی جرات رندانہ کے باعث یہ کام کر گزرے۔

قاضی حسین احمد کے ایسا کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ مولانا مودودی کی شخصیت اصل روپ کے ساتھ نکھر کر سامنے آگئی۔ ان کی چند باتوں کو لے کر مخالفین نے ان کی شخصیت کے بہت سے مفید پہلوؤں کو چھپا دیا تھا۔ قاضی حسین احمد نے ایسے لوگوں کے لیے وہ راہ مسدود کر دی اور مولانا مودودی کو بحیثیت بے مثل مفکر لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اب جس شخص نے مولانا مودودی کے حوالے سے بات کرنی ہے، وہ کوئی فکری بات ہی کرے گا۔ طعن و تشنیع یا لالچی وغیرہ مفید ابحاث کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، اگرچہ بعض لوگ اب بھی گڑے مردے اکھاڑنے میں لگے رہتے ہیں۔

ایسے ہی اگر ہر مسلک کی نمائندہ شخصیات اپنے اکابر کی ایسی باتوں کو ختم کرنے کی طرف توجہ دیں تو ہم بجا طور پر ایک اچھی روایت کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔ ایسی عبارات کی نشاندہی کوئی مشکل کام نہیں۔ ان پر باقاعدہ مختلف مسالک کے علماء کی کتابیں اور مناظرے موجود ہیں۔ اپنے مسلک کی کسی بڑی اور عقیدتوں کی مرکز شخصیت کی تصانیف سے اس قسم کا مواد ہٹانا یقیناً بہت مشکل ہے۔ شاید اس کو ناممکن بھی کہا جاسکے۔ اس سے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں، مسلکی طور پر لوگوں کا یقین و اعتبار اٹھنے کا خطرہ ہوتا ہے، لیکن جتنا یہ پر امن بقائے باہمی اور شدت پسندی کے خاتمے کے لیے ضروری ہے، اتنا ہی علمی ترقی اور مکالماتی ماحول میں مفید ابحاث پر گفت و شنید کے لیے بھی ضروری ہے۔ ہمارے ہاں مکالماتی ماحول اٹھ چکا ہے۔ اس کی جگہ جدل و مناظرہ نے لے لی ہے جس کا اختتام کسی فائدے کی بجائے باہمی رقابتوں میں اضافے، ماحول میں کشیدگی اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے پر ہوتا ہے۔ مفید علمی ابحاث کا مکالمہ

ایک عرصہ ہوا شاید ختم ہی ہو چکا ہے اور ان حالات میں علمی ترقی ایک خواب اور سراب ہی ہو سکتی ہے۔

3- ہمارے ہاں طویل عرصہ سے چلنے والے مسلکی اختلافات دشمنی اور رقابت کا روپ دھار چکے ہیں جن میں ایک دوسرے سے شدید نفرت و عداوت پائی جاتی ہے۔ ان حالات میں ایک دوسرے کے بارے میں غلط فہمیوں کا پیدا ہو جانا بھی لازمی اور یقینی امر ہے۔ ہم کسی کا نقطہ نظر اس سے معلوم کرنے کی بجائے خود ہی طے کر کے اس پر فرضی قضیوں کی پوری عمارت تیار کر لیتے ہیں، ایسے میں غلط فہمیوں کا پیدا ہونا اور بھی لازمی اور یقینی ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان غلط فہمیوں میں خیانت کا بھی دخل ہو، لیکن ابتدائی طور پر کی گئی خیانت بعد میں ذہن میں رچ بس کر فکر کا ایسا حصہ بن جاتی ہے جس پر انسان از سر نو غور نہیں کرتا اور ایسے خیالات ایک دوسرے کے بارے میں نسل در نسل چلتے رہتے ہیں۔ یہ غلط فہمیاں سیاسی، معاشرتی اور مذہبی ہر طرح کے مسائل میں ہو سکتی ہیں۔ سب سے زیادہ غلط فہمیاں دوسروں کی عبارات و نظریات کی تفہیم میں ہوتی ہیں۔ ہر مسلک والے لازماً خود پر ہونے والی تنقید میں یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ ان کے موقف پر دینتدارانہ غور و فکر نہیں کیا گیا بلکہ اس سے من مانے معانی اخذ کر کے خیانت کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ یہ صرف آج کے دور میں ہی ایسا نہیں بلکہ ابتدائی ازمہ سے ہی ہم مختلف مسالک کی آویزش میں ایسی بہت سی مثالیں تلاش کر سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مکالماتی ماحول پیدا کیا جائے جس میں مختلف مسالک کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آسکیں اور باہم غلط فہمیاں دور کر سکیں۔ اس مکالماتی ماحول میں بازاری علماء اور پیشہ ور مناظرین جن کی روزی روٹی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور کسی بھی طرح غلط ثابت کرنے سے وابستہ ہو، ان کو دور رکھ کر سنجیدہ اور امن کی چاہت رکھنے والے علماء کو موقع دیا جائے۔

4- ایسی تحریروں، تقریروں، جلسے جلوسوں اور مناظروں پر پابندی عائد کی جائے جن سے باہمی نفرت میں اضافہ اور ماحول میں کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔ ایسے علماء و مناظرین کی ذہنی اور اخلاقی سطح کو بہتر بنانے کے لیے مختلف تربیتی کورسز اور ورکشاپس کا اہتمام کیا جائے۔ ان علماء کی توجہ جدید مسائل اور اسلام کی آفاقیت کو درپیش چیلنجز کی طرف مبذول کروائی جائے تاکہ ان کی صلاحیتیں کسی اچھے مصرف میں استعمال ہو سکیں۔ دور جدید میں اسلام کو کس قسم کے چیلنجز اور مسائل کا سامنا ہے اور مسلم امہ کے مسائل کیا ہیں؟ مسالک سے ماوراء مذاہب کی رقابت موجودہ دور میں کس موڑ پر پہنچ چکی ہے؟ اور پھر اس سے بھی آگے مذہب کو لادینیت اور دہریت کی موجودہ جن شکلوں سے سابقہ ہے، اس کا ادراک علماء امت کو ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ٹیم ورک کی ضرورت ہے اور ایسے افراد کو پیدا کرنا ضروری ہے جو علماء کی ان خطوط پر تربیت کر سکیں۔

### پرائیویٹ جہادی گروپوں کا خاتمہ:

علماء کرام کے موجودہ قومی بیانیہ کی حیثیت اختیار کر جانے والے فتویٰ میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ جہاد صرف ریاست کا حق ہے، ریاست کے اندر ریاست بنانے کی کسی کو اجازت نہیں اور ریاست کی اجازت کے بغیر کوئی جہاد نہیں کر سکتا۔ اس بات پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے اور اس فتویٰ کے بعد اس قسم کے تمام فتاویٰ جن سے دہشت

گروں کی پشت پناہی یا نظریات کو تقویت ملتی ہو، ختم کرنا بھی ضروری ہے۔ ایسے افراد یا جماعتیں جو اس کام میں ملوث رہی ہیں، ان کو قومی دھارے میں لانے کی ضرورت ہے۔ ایسے افراد اگر سیاست میں حصہ لیتے ہیں یا فلاحی کام کرتے ہیں تو ہمیں اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ تاہم لوگوں کو پرائیویٹ جہاد کے لیے تیار کرنے والوں، یا ایسے لوگوں کی کسی بھی قسم کی اعانت کرنے والوں کے خلاف سخت قانونی کارروائی ہونی چاہیے اور جن جماعتوں کو کالعدم قرار دیا جا چکا ہے، ان کو کسی دوسرے نام سے وہی کام کرنے کی اجازت بالکل نہیں ہونی چاہیے۔ علماء کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے لوگوں کا نظری سہارا ختم کریں تاکہ جن نصوص کی بنیاد پر وہ خود غلط فہمی کا شکار ہیں یا لوگوں کو تیار کرتے ہیں، ان سے وہ استدلال نہ کر سکیں اور درست راستے کی طرف آسکیں۔

### دیگر ممالک اور عالمی پالیسیوں پر نظر رکھنا:

ہمارے ملک میں دہشت گردی کی بڑی وجہ دوسرے ملکوں کی مداخلت بھی ہے۔ دوسرے ملکوں کے وہ لوگ جو اپنے مفادات کے لیے کسی خاص مسلک کی پشت پناہی کر رہے ہیں، اس کو جس حد تک ہو سکے روکا جائے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ایران پاکستان میں شیعہ گروہوں کی سب سے زیادہ امداد کرتا ہے۔ اب ایران ہو، سعودیہ یا کوئی اور ملک، یہ لوگ مذہبی نام پر مختلف مسالک یا تنظیموں کی مدد کرتے ہیں اور ان سے سیاسی مفادات حاصل کرتے ہیں۔ پاکستان کے مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے لوگ آج بھی ایران یا سعودیہ کے مختلف محاذوں پر باقاعدہ سپاہی کا کام کر رہے ہیں اور اس کا محرک صرف مذہبی عقیدت ہے اور یہ سب ریاست سے ماوراء ہو رہا ہے۔ ایسے عناصر اور ان کے سرکردہ لوگوں پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح عالمی طور پر دہشت گردی نے ایک کاروبار کی شکل اختیار کی ہوئی ہے۔ امریکہ یا مختلف ملک باقاعدہ تنظیموں پر سرمایہ کاری کرتے ہیں اور اس کو کاروبار سمجھتے ہیں۔ جانے انجانے میں ان کی آلہ کار بننے والی شدت پسند تنظیموں اور جماعتوں پر بھی کڑی نظر رکھی جائے۔ یورپی اور مغربی ممالک پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کو متاثر کرنے کے لیے جس قدر سرمایہ کاری کرتے ہیں، اس کا ادراک و احساس بھی ضروری ہے۔

علماء کرام کے متفقہ فتوے میں یہ بات بھی موجود ہے جسے قوم کو اچھی طرح ذہن نشین کروانے کی ضرورت ہے کہ اسلام کے نام پر آئین کو پرے پھینک کر اور جغرافیائی سرحدوں کو نظر انداز کر کے کسی دوسرے ملک میں لشکر کشی کا حصہ بننا بھی خلاف اسلام ہے اور عہد شکنی کے زمرے میں آتا ہے۔ پاکستانی شہری پر لازم ہے کہ وہ دستور میں کیے گئے عمرانی معاہدے کی پابندی دیں اور کسی بیرون ملک گروہ کی مدد کے نام پر اس بیثاق کی خلاف ورزی نہ کریں کیونکہ ایسا کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہوگا۔

### ریاستی پالیسیاں:

سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ریاست کی پالیسیاں بالکل صاف شفاف اور ملکی و عالمی قوانین و معاہدات کے مطابق ہوں۔ عالم اسلام میں مختلف مسلم ممالک میں جو ظلم و زیادتی کے واقعات ہیں، ہمیں ان کی سیاسی و

سفارتی سطح پر مذمت کرنی چاہیے، تاہم دنیا بھر میں کسی بھی جگہ بشمول افغانستان، کشمیر، فلسطین وغیرہ، ہمیں نہ صرف ریاستی سطح پر مسلح جدوجہد کی پشت پناہی نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہمارے ملک کے ایسے لوگ یا تنظیمیں جو ان جگہوں پر مسلح جدوجہد میں مصروف عمل ہیں، ان کے خلاف سخت تادیبی کارروائی عمل میں لانی چاہیے، اور شدت پسندی کے رویے پر بنی کسی بھی تنظیم کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے، نہ کہ حوصلہ افزائی۔

### سماجی اور معاشرتی اصلاحات:

دہشتگردی کے خاتمے اور پر امن معاشرے کے قیام کے لیے مذہبی، معاشی، معاشرتی، قانونی اور تمام شعبہ ہائے زندگی میں عدل و انصاف بہت ضروری ہے۔ معاشرے میں کچھ طبقات کے حقوق کو مسلسل نظر انداز کرنے سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان کا اچھی طرح ادراک بہت ضروری ہے۔ وہ افراد اور گروہ جو مایوسی اور محرومی کی زندگی گزار رہے ہیں، وہ اپنے ادنی مفادات کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں، اس لیے ہمیں انہیں حقوق دے کر ان کا احساس محرومی ختم کرنا چاہیے۔ ہمارے ملک میں مذہبی، معاشی، معاشرتی، قانونی، لسانی اور صوبائی سطحوں پر لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہے جن کے اندر نہ صرف احساس مایوسی اور محرومی پنپ رہا ہے بلکہ ایک آتش فشاں کی شکل اختیار کر رہا ہے جس کے پھٹنے سے جو نقصان ہوگا، اس کی قیمت ہمیں نسل در نسل چکانی پڑے گی، اس لیے ہمیں نہ صرف ان لوگوں کی شکایات کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سننا ہوگا بلکہ ان کو مساوی حقوق بھی مہیا کرنا ہوں گے۔ حقوق سے محرومی کے معاملے میں مذہبی اقلیتوں اور چھوٹے و پسماندہ صوبوں اور علاقوں کے لوگوں کا لحاظ خاص طور پر ضروری ہے۔

اسی طرح دہشت گردی، بد امنی اور جرائم کے بنیادی اسباب یعنی غربت جہالت اور کرپشن کے خاتمے کے لیے موثر اور سنجیدہ اقدامات کیے جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ روايتی کھیلوں، ثقافتی میلوں، موسیقی، ڈرامے اور دیگر تفریحی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے باضابطہ پالیسیاں مرتب کی جائیں تاکہ فرسٹریشن سے پاک ایک اچھا اور صحت مند معاشرہ قائم ہو سکے۔

## سماجیات

### معاون درسی کتاب

مرتبین: خورشیدا احمد ندیم / محمد حسین

**موضوعات:** سماج اور فرد، سماج اور اخلاقیات، اخلاقی اور سماجی رویے، سماجی علوم اور شخصیت سازی، سماج اور آئین، سماجی ادارے، اہم سماجی تنازعات  
ناشر: ادارہ تعلیم و تحقیق اسلام آباد

051-4900232 / ore.pak@gmail.com

ماہنامہ الشریعہ ————— ۳۳ ————— مارچ ۲۰۱۸

## تین طلاقوں کا مسئلہ

جناب محترم مفتی شبیر احمد صاحب کی ہدایت پر اس ناچیز نے جناب ڈاکٹر طفیل ہاشمی صاحب کا مضمون "یکبارگی تین طلاقوں کے نفاذ کا مسئلہ" مطالعہ کیا، لیکن افسوس مجھے شدید مایوسی ہوئی کہ انہوں نے تین طلاقوں کو تین ہی قرار دینے کی کچھ خود ساختہ علتیں بیان کی ہیں۔ ان علتوں کو طلاق کے مسئلے سے منسلک کرنے کے لیے انہوں نے قرآن و سنت سے کوئی دلیل نہیں دی، بلکہ "عرب معاشرے اور سماج" کی کچھ خصوصیات کو اپنی دانست میں تین طلاقوں کے اکٹھے نفاذ کی علت قرار دے دیا ہے اور پھر خود ہی نتیجہ نکالتے ہوئے فرمایا ہے کہ چونکہ آج ہمارے "معاشرے" میں یہ علتیں موجود نہیں ہیں، اس لیے تین طلاقوں کو تین نہیں بلکہ ایک طلاق قرار دینا چاہیے۔ حالانکہ اگر ان علتوں کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر سرے سے طلاق کے تصور ہی کو ختم کرنا پڑے گا۔ کجا ایک، دو اور تین طلاقوں کی بحث میں انسان اُلجھے! ا۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ "عرب معاشرے" میں عورت کو مہر کی ادائیگی نکاح کے قبل یا پھر فوراً بعد کی جاتی تھی اور اس پر عورت کا قطعی حق تسلیم کیا جاتا تھا، جبکہ آج کل عورت کو مہر کی ادائیگی نہیں کی جاتی یا مہر کی مقدار بہت تھوڑی مقرر کی جاتی ہے۔

مہر کی ادائیگی اور اس کی ملکیت تو عورت کا قطعی حق اب بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کس نے آ کر یہ حق تین طلاقوں کو ایک سے بدلنے کے عوض سلب کر لیا ہے؟ مہر کے تقرر اور ادائیگی کا تعلق نکاح سے ہے، نہ کہ طلاق سے۔ نکاح کے منعقد ہونے کے لیے مہر مقرر کرنا شرط ہے جس کے بغیر نکاح ہی درست نہیں ہوتا، کجا کہ طلاق کا سوال پیدا ہو سکے۔ اگر عورت کو حق مہر سے محروم رکھا جاتا ہے تو اس کی حق تلفی کو روکنے کے لیے مرد کو ریاستی طاقت یا عدالت کے ذریعے حق مہر ادا کرنے پر مجبور کیا جائے۔ طلاق کا قانون چھیڑنے کی کوئی سبیل نہیں۔

۲۔ دوسری علت ڈاکٹر صاحب نے یہ بیان فرمائی ہے کہ عرب معاشرے میں طلاق کے بعد بچوں کی ذمہ داری مرد پر ہی عائد ہوتی تھی، آج کل عورت پر سارا بار ڈال دیا جاتا ہے۔ بچوں کی پرورش کی ذمہ داری طلاق سے پہلے بھی اور بعد میں بھی مرد پر ہی عائد ہوتی ہے۔ شریعت کا یہ حکم بھی منسوخ کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا۔ بچوں کی ذمہ داری عورت

\* ڈائریکٹر فاہ ایڈ، ایڈمنسٹریٹر السلام ویلفیئر فاؤنڈیشن، (مین) کابل آفس

Email: dr mukhtaronline@gmail.com

ماہنامہ الشریعہ \_\_\_\_\_ ۳۴ \_\_\_\_\_ مارچ ۲۰۱۸

پر ڈالنے کے بدلے میں مرد کی دی گئی تین طلاؤں کو ایک تصور کر لینا دین میں خود ساختہ قطع و برید سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ بہانے بازیاں دراصل شریعت اسلامی کے متعلق پھیلائی گئی سیکولر اور لبرلز طبقات کی ڈس انفارمیشن مہم کا حصہ ہے جس سے بعض مسلمان مفکرین غیر ارادی طور متاثر ہوئے ہیں۔

۳۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق عرب معاشرے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مطلقہ اور بیوہ سے شادی کرنا نہ صرف معیوب تصور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ مستحسن امر گردانا جاتا تھا۔ یہ خصوصیت تو درحقیقت عرب معاشرے کی اسلامائزیشن کا اثر تھا۔ اسلام نے اس ٹھمٹے رویے کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس کی طرف اور زیادہ مؤثر انداز سے ترغیب دی، لیکن اس کا طلاق کے منعقد ہونے یا نہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔

یہ ہمارے آج کے معاشرے کا ایک بڑا المیہ ہے کہ طلاق کو عورت کے لیے (اور بعض علاقوں میں مرد کے لیے بھی) ایک گالی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ طلاق یافتہ عورت کو طلاق ہونے کا واحد سبب اس کی مبینہ "بد کرداری" ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے شادی کرنا پورے معاشرے کی توپوں کا رخ اپنی طرف کرانے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ یہ معاشرے کی جاہلانہ سوچ ہے۔ لڑکی کی منگنی ٹوٹنے یا اس کو طلاق ہو جانے کو محض بد کرداری کی عینک سے دیکھ کر اس کو ہمیشہ کے لیے اچھوت قرار دینا معاشرے میں علم اور سمجھ بوجھ کے عتقا ہونے کی علامت ہے، نہ کہ طلاق کے قانون میں خرابی کی دلیل۔ شریعت مرد کو طلاق کی مطلق اجازت دیتا ہے۔ طلاق کی بہت سی دیگر وجوہات بھی ہیں جو ضروری نہیں کہ عورت کی بد کرداری پر ہی دلالت کرتی ہوں۔ معاشرے کی اس جہالت کو دور کرنے کی بجائے طلاق کے منعقد ہونے یا نہ ہونے کو اس خود ساختہ علت پر موقوف ٹھہرایا جا رہا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔

۴۔ ڈاکٹر طفیل ہاشمی صاحب کا یہ فرمانا کہ "عرب معاشرے میں اکٹھے تین طلاؤں کو نافذ کرنے کا نقصان مرد کو ہوتا تھا، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مرد کو سزا دینے کے لیے اسے نافذ کیا، اور ساتھ میں اکٹھے تین طلاق دینے والے مرد کو تعزیری سزا بھی دیتے تھے" بھی میرے ناقص خیال میں ناواقفیت پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرد کو تعزیری سزا دینے کے حضرت عمر کے فیصلے کو تو باقی رکھنا چاہتے ہیں، البتہ تین طلاؤں کو تین ہی نافذ کرنے کے حضرت عمر کے اسی فیصلے کے دوسرے پہلو کو ختم کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ تین طلاقیں ایک ساتھ دینا معصیت ہے اور اس معصیت کا ارتکاب نہ صرف مرد کے لیے رجوع کی گنجائش باقی نہیں چھوڑتا بلکہ عورت کو بھی مرد کی رنجش اور ناراضگی دور کرنے کے مواقع سے محروم کر دیتا ہے، تبھی حضرت عمر نے اس کے لیے تعزیری سزائیں دیں۔ اگر تین طلاقیں بیک وقت واقع ہی نہ ہوتیں تو یہ ایک لغو فعل ہوتا۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص پر غضبناک ہوتے جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں ایک ساتھ دی تھیں اور نہ حضرت عمر تعزیری درے لگواتے۔ قرآن اور احادیث رسول کی روشنی میں ایک اچھے مسلمان کی علامت یہ ہے کہ وہ لغو باتوں سے تعرض نہیں کرتے۔

ڈاکٹر صاحب نے معاشرے کی جاہلانہ رسوم و رواج اور ان کے نتیجے میں عورت پر مرتب ہونے والی زیادتیوں کا ذمہ دار سراسر تین طلاؤں کے یکبارگی انعقاد کو قرار دے کر ثابت کیا ہے کہ انہیں کچھ بھی ایسا چاہیے جس سے ایک مجلس

میں دی گئی تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیا جاسکے۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اگر ان کی رائے کو اپناتے ہوئے مرد تین مختلف اوقات میں طلاق دے کر عورت کو گھر سے نکالے گا تو پھر کیا اس کو مہر کی ادائیگی فرشتے اتر کریں گے؟ کیا اس صورت میں بچوں کی ذمہ داریاں مرد اٹھانے پر رضا کارانہ تیار ہو جائے گا؟ کیا اس صورت میں مہر کے کم ہوتے ہوئے بھی عورت مالدار ہو جائے گی؟ کیا پھر طلاق یافتہ عورتوں کو بدکردار سمجھنے کا رجحان جڑ سے اکھڑ جائے گا؟ اور ان سے شادی کرنے میں کوئی امر مانع نہیں رہے گا؟ میرے خیال میں تو جو عورت اس طرح طلاقیں لے کر گھر سے نکلے گی، وہ زیادہ ذلت و رسوائی کا سامنا کرے گی۔ اگر معاشرے کی اصلاح کی بجائے طلاق کے قوانین کا "اصلاح" کے نام پر اس طرح حلیہ بگاڑا جاتا رہا تو ایسی صورت میں طلاق یافتہ عورت سے نکاح کرنا تو درکنار، کوئی ترس کھا کر اس کو بھیک بھی نہیں دے گا۔

اب ذرا اس پر نظر ڈالتے ہیں کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واقعی ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ انہی معاشرتی علل کے تحت تین طلاقوں کو تین نافذ کیا تھا یا اس کی دلیل "شرعی" ہے؟ مستند احادیث کے مطابق اکٹھی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوتی ہیں جسے فقہی اصطلاح میں طلاق مغلظ کہا جاتا ہے۔ مستند اور صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود تین طلاقوں کو نافذ کیا ہے، لیکن طلاق دینے والے کو اللہ کی نافرمانی کا مرتکب بھی قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کی والدہ کو ہزار طلاقیں دیں۔ انہوں نے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا:

بانت منه بثلث فی معصیة اللہ تعالیٰ، وبقی تسع مائة وتسبع  
ظلماً وعدواناً؛ ان شاء اللہ عذبه وان شاء غفر له  
”تین طلاقوں سے تو اللہ کی نافرمانی کے ساتھ وہ عورت اس سے جدا ہوگئی، اور باقی نو سو ستانوے طلاقیں ظلم اور عدوان کے طور پر باقی رہ گئی ہیں جن پر اللہ چاہے تو اسے (یعنی تیرے باپ کو) عذاب دے اور چاہے تو معاف کر دے۔“

البتہ ایک حدیث میں، جس سے انتہائی کمزور طرز استدلال کے ذریعے یکبار دی گئی تین طلاقوں کو ایک طلاق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ذکر ہے کہ ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دیتے وقت محض تاکید کی خاطر لفظ "طلاق" کو تین بار دہرایا تھا حالانکہ میری نیت ایک ہی طلاق دینے کی تھی۔ آپ نے اس سے دوبارہ پوچھا کہ کیا واقعی تم نے ایک ہی طلاق کی نیت کی تھی؟ اس نے اقرار کیا۔ تب آپ نے اسے ایک طلاق قرار دیا۔ تین طلاقوں کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے اس حدیث کا سہارا لیتے ہیں، حالانکہ یہ حدیث بھی تین طلاقوں کو تین ثابت کرنے میں صریح ہے، کیونکہ اس میں نیت ایک طلاق کی ہونے کی تصریح ہے۔ لہذا اس کو تین کی نیت سے دی گئی طلاقوں کو ایک قرار دینے کی دلیل کس طرح بنایا جاسکتا ہے؟

اس واقعے کو بنیاد بنا کر لوگ کثرت سے تین طلاق دینے کے بعد یہی عذر تراشنے لگے کہ ان کی نیت فقط ایک ہی طلاق کی تھی جس پر حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں لوگوں کے اس قسم کے دعووں پر اعتماد کرنے سے انکار کرنے کا اعلان کیا کہ آئندہ ایسا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا اور تین طلاقیں تین ہی سمجھی جائیں گی۔ عہد نبوی میں کسی ضعیف الایمان شخص کو بھی جرات نہیں ہوتی تھی کہ وہ کوئی بیان خلاف واقعہ دے سکے کیونکہ یہ خوف تھا کہ کہیں اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر آشکارا نہ کر دے۔ (غالباً حضرت عبداللہ بن عمر سے منقول ہے کہ عہد نبوی میں ہم اپنی بیویوں کے ساتھ بھی دل کھول کر بے تکلفی کرنے سے ڈرتے تھے، مبادا ہمارے بارے میں وحی نازل نہ ہو جائے)۔ لیکن عہد رسالت کے بعد یہ اندیشہ نہیں رہا تھا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام پر کسی ایک صحابی نے بھی اعتراض نہیں کیا، حالانکہ ان کے دور میں اگر ایک بدو کو بھی شبہ ہوتا کہ کسی معاملے میں امیر المؤمنین سے خلاف سنت یا خلاف انصاف فعل سرزد ہو رہا ہے تو وہ فوراً بلا خوف اور براہ راست انہیں ٹوک سکتا تھا۔

لہذا اگر تین طلاقوں کی یکبارگی نفاذ کے سلسلے میں وہ قرآن مجید یا سنت رسول کی منشاء کے خلاف کوئی قانون وضع کر رہے ہوتے تو جماعت صحابہ میں ان کی بھرپور مخالفت کی جاتی۔ اور یہ کوئی ایسا غیر معمولی اقدام نہ تھا جس پر کبار صحابہ میں سے کوئی بھی نوٹس نہ لیتا۔ نہ صرف ان کے دور میں کسی نے اس کے خلاف رائے نہیں دی بلکہ ان کے بعد حضرات عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کے ادوار خلافت میں بھی اکٹھی دی گئی تین طلاقوں کو تین قرار دینے پر اتفاق رہا۔ بعد کے ادوار میں بھی بشمول ائمہ اربعہ متفقہ مسلک یہی بن کر سامنے آیا۔ آج بھی پوری دنیا کے اندر علمائے دین کی عظیم اور غالب اکثریت اسی قول کو رائج مانتی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو اصل مسئلہ طلاق کا نہیں، بلکہ طلاق کے بعد دونوں خاندانوں میں بالخصوص اور معاشرے کے رویوں میں بالعموم افراط و تفریط پر مبنی رویوں کا ہے جسے دعوت، تعلیم و تربیت اور تزکیہ نفوس کے ذریعے دور کرنا ایک صبر آزما اور محنت طلب کام ہے۔ اگر اصلاح، آگاہی اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کا مطلوب شریعت کچھ پیدا کیا گیا تو پھر نہ بچوں کی پرورش کا بہانہ بنا کر "حلالہ" جیسے ملعون افعال کا ارتکاب کرنے کی "ضرورت" باقی رہے گی اور نہ ہی عورت کو طلاق کے بعد دوسری یا تیسری شادی میں کوئی مشکل پیش آئے گی۔ لیکن ہمارے دانشور حضرات بنیادی کام سے جان چھڑا کر شارٹ کٹ کے چکروں میں پڑ گئے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اس طرح کی کچھ ملمع کاریاں کر کے وہ کچھ معاشرتی مسائل کو ڈھانپ سکیں گے اور اسلام کے چہرے پر جمی "گرد" کو صاف کر کے سیکولر اور لبرل طبقات کی طعنہ زنی سے بچ جائیں گے، حالانکہ یہ انداز فکر سراسر غیر علمی ہونے کے ساتھ ساتھ عملاً ناممکن بھی ہے۔

## قرآن مجید میں خدا کے وعدوں کو سمجھنے میں غلطی

اسلام کے دشمنوں نے مختلف زمانوں میں اسلام کو ناقص بنانے اور اس کے اجزاء میں کتر بیونت پیدا کرنے اور پیوند کاری کی کوششیں کی ہیں جس میں وہ ہمیشہ ناکام ہوتے رہے ہیں کیونکہ دین کی حفاظت کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیشہ اہل علم پیدا فرمائے جو دین کو اس کی مکمل شکل میں باقی رکھنے کے لئے جدوجہد کرتے رہے کیونکہ اسلام مکمل اور آخری دین کی صورت میں آیا ہے اور اس کو قیامت تک اسی طرح مکمل طریقہ سے باقی رہنا ہے۔ اس وقت بھی دین کو اس کی مکمل شکل سے ہٹا کر پیش کرنے کی کوششیں وقتاً فوقتاً ہوتی نظر آتی ہیں اور بعض اوقات غلط فہمی، کم علمی یا کسی شخصیت کی حاضر جوابی اور عقلی استدالات سے متاثر ہو کر بعض اہل علم اور اہل قلم حضرات بھی غلط نظریات، افکار اور رجحانات کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان غلط افکار، نظریات و رجحانات کی ترویج کے لیے کبھی کبھار زبان کے ساتھ ساتھ قلم کی مدد بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ پچھلے مہینے ایسے ہی ایک صاحب قلم محترمی و کرمی جناب اکثر عرفان شہزاد صاحب کا مضمون ماہنامہ الشریعہ کے جنوری کے شمارے میں پڑھنے کا اتفاق ہوا جس پر چند تحفظات پیش کرنا مقصود ہے۔

محترم موصوف کے مضمون ”قرآن مجید میں خدا کے وعدوں کو خدا کا حکم سمجھنے کی غلطی“ کو بار بار پڑھنے سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے اور جہاں تک موصوف کے موقف کو سمجھا گیا ہے، اس کو دو نکات میں مختصر ایوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئے گئے تمام یا اکثر (جن کا مضمون میں تذکرہ کیا گیا ہے) وعدے عمومی حیثیت کے نہیں ہیں بلکہ مخصوص ہیں۔ ان کا مصداق نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) تھے جو مجموعی طور پر امت مسلمہ کو شامل نہیں ہیں۔

اس موقف کو اختیار کرنے کے لیے جس نظریے کا سہارا لیا گیا ہے وہ کچھ یوں ہے:

۲۔ مسلمانوں کا اسلام کے سیاسی غلبے کے لیے جدوجہد کرنا حالات کا تقاضا تو ہو سکتا ہے، انسانی سماج کی ضرورت تو ہو سکتی ہے لیکن اس جدوجہد کو دینی فریضہ سمجھ کر سرانجام دینا مسلمانوں کی غلط فہمی اور قرآن مجید میں خدا کے وعدوں سے ناواقفیت ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس جدوجہد کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت، فتح و کامرانی حکمت کا تقاضا تو ہو سکتا ہے لیکن شرط، ذمہ داری یا کوئی عام قانون نہیں۔

\* nts143043@gmail.com

موصوف کے مضمون کا تنقیدی جائزہ پیش کرنے سے قبل اس بنیادی غلط فہمی کا ازالہ ناگزیر ہے جو موصوف کے مذکورہ بالا نظریے کی پشت پر کارفرما دکھائی دیتا ہے اور وہ بنیادی غلط فہمی ”دین اور سیاست و ریاست کے رشتے“ سے ناواقفیت ہے جس کے نتیجے میں اجتماعی جدوجہد وجود میں آتی ہے۔ دین و سیاست کا رشتہ بے حد نازک ہے اور اس رشتہ کو بیان کرنا پل صراط پر چلنے سے زیادہ مشکل کام ہے کیونکہ کسی ایک پہلو پر ضرورت سے کم یا ضرورت سے زیادہ بات کرنا آسمانی دین کی غلط تشریح تک پہنچا دیتا ہے۔ اسلام کے سیاسی غلبے کو اگر نظر انداز کیا جائے تو موجودہ سیاسی کشمکش اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالمی استعماری سازشیں بے معنی ہیں کیونکہ حزب اختلاف اسلام کو ہر شخص کی انفرادی زندگی کے طور پر قبول کرنے کا برملا اعتراف کر چکے ہیں۔

امریکہ کے مشہور مصنف جے ولیم فیڈرر اپنی کتاب What Every American Needs to know about the Qur'an میں اسلام کو ایک دہشت گرد اور خونخوار مذہب کے طور پر پیش کرنے کے باوجود انفرادی طور پر اسلام کے مستقبل کے بارے میں رقمطراز ہیں:

We say to Muslim believers there is a noble future for Islam as a personal faith, not a political doctrine.

ترجمہ: ”ہم مسلمانوں سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سیاسی غلبے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انفرادی طور پر اسلام کا مستقبل خوش آئند ہے۔“

یہی وہ موقف ہے جس کے بارے میں مفکر اسلام سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی وفات سے دو سال قبل اپریل 1997ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبہ ”دعوت و تربیت“ کی زیر نگرانی قائم ”المعهد العالمی للدعوة والفکر الاسلامی“ کے زیر اہتمام ایک پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: ”اہل مغرب اسلام کو بحیثیت عالمگیر دعوت، سیاسی قوت اور مذہبی آزادی کے اتنا کمزور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ محدود رقبہ میں اور خاص نسل اور قومیتوں کے دائرہ کے اندر ہی نافذ اور کارفرما رہے، لیکن عالمی پیمانے پر اس کا وجود اور نفوذ ختم ہو جائے۔“

حضرت عمر کے دور میں ربیع بن عامر سرداران فارس کے دربار میں سفیر بن کر گئے تھے اور اپنی تقریر میں اسلام کی تعریف کے دوران اسلام اور سیاست کے نازک رشتے اور حساس تعلق کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں:

فَقَالُوا لَهُ مَا جَاءَ بِكُمْ؟ فَقَالَ، اللَّهُ ابْتَعَثَنَا لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللَّهِ وَمِنْ ضَيْقِ الدُّنْيَا إِلَى وَسْعَتِهَا وَمِنْ جَوْرِ الْأَدْيَانِ إِلَى عَدْلِ الْإِسْلَامِ فَارْسَلْنَا بِدِينِهِ إِلَى خَلْقِهِ لِنُدْعُوهُمْ إِلَيْهِ (الهداية والتهامية/الجزء السابع/غزوة القادسية)

”اہل دربار نے پوچھا کہ تم لوگ یہاں کس لئے آئے ہو؟ ربیع بن عامر نے جواب دیا: اللہ نے ہمیں اس لئے بھیجا ہے تاکہ وہ جسے چاہے اسے بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کرے، دنیا کی تنگی سے آخرت کی وسعت کی طرف، مذاہب کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف لائیں۔ پس اللہ نے ہم

کو اپنے دین کے ساتھ اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے تاکہ ہم لوگوں کو اس طرف بلائیں۔“  
اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ *عِبَادَةُ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللَّهِ* سے مطلق العنان اور استبدادی نظام حکومت و سیاست سے نجات دلانا مراد ہے، *وَمِنْ ضَيِّقِ الدُّنْيَا إِلَى وَسَعَتِهَا* میں اسلام کی جہاں گیری اور وسعت و آفاقیت کا ذکر ہے اور *وَمِنْ جَوْرِ الْأَدْيَانِ إِلَى عَدْلِ الْإِسْلَامِ* سے اسلام کے عادلانہ قوانین کی طرف اشارہ ہے؟

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

”دین میں سیاست اور روحانیت دونوں کی اہمیت ہے۔ سیاست اور سلطنت کو نظر انداز کر دینا یا اسلامی معاشرہ میں اسلام کے معاشی، سیاسی اور اجتماعی قوانین کے نفاذ کی کوششوں کا تسخیر اور استہزاء غلط تصور دین کا حامل ہونا ہے اور اس کج فکری و مسلمانوں کے ذہنوں تک پھیلانا ایک محرف دین کی طرف مسلمانوں کو بلانے کے مرادف ہے۔“

مزید لکھتے ہیں:

”جب کبھی دین و سیاست میں جدائی ہوتی ہے دو، گروہ معرض وجود میں آتے ہیں۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو دین دار تو ہوتے ہیں، لیکن قوتِ حرب، وجاہ و مال سے، جس کا دین خداوندی ضرورت مند ہوتا ہے، دین کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ دوسرا گروہ ایسے امراء و حکام پر مشتمل ہوتا ہے جو مال اور حربی قوت کو بروئے کار تو لاتے ہیں، لیکن اس سے ان کا مقصد دین کی اقامت نہیں ہوتا۔ دونوں گروہ اسلام کے لیے بے کار ہیں۔“ (السیاسة الشرعية)

علامہ سید سلیمان ندوی اس موضوع پر رقم طراز ہیں:

”اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت و سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے، یہاں تک کہ کتاب و نبوت کی دولت کے بعد اس کا درجہ ہے۔“ (سیرۃ النبی جلد ۷ صفحہ ۵)

مزید فرماتے ہیں:

”اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی و جنت سماوی اور آسمانی بادشاہت اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا ہے۔ اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دونوں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے نہ کوئی کسریٰ۔ اس کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے۔ وہی آسمان پر حکمراں ہے، وہی زمین پر فرماں روا ہے۔“ (سیرۃ النبی جلد ۷ ص ۷)

یہی اسلام کی انفرادیت ہے کہ یہ تسبیح و مناجات کے ساتھ سیاسی شوکت اور اجتماعی قوت کا ضامن ہے اور اسی لئے اقبال نے کہا ہے:

وہ نبوت ہے مسلمان کے لیے برگ و حشیش

جس نبوت میں نہ ہو قوت و شوکت کا پیام

اقبال کا یہ شعر محض ایک شعر نہیں بلکہ قرآن کریم کی چند آیتوں کا پر تو ہے:

وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ (المنافقون: ۸)

”اور اللہ ہی کے لئے غلط و عزت اور اس کے رسول کے لئے اور مؤمنین کے لئے“ (المنافقون: ۸)

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (آل عمران: ۱۳۹)

”ہراساں اور غم زدہ مت ہو، تم ہی سر بلند ہو گے اگر تم صاحب ایمان ہو۔“

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

”اسلام کا قانون شرعی یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ و امام ہونا چاہیے۔ خلیفہ سے مقصود

ایسا خود مختار مسلمان سربراہ اور صاحب حکومت و مملکت ہے جو مسلمانوں اور ان کی آبادیوں کی حفاظت اور

شریعت کے اجراء و نفاذ کی پوری قدرت رکھتا ہو اور دشمنوں سے مقابلہ کے لیے پوری طرح طاقتور ہو۔“

[تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص ۵۱]

اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ غلبہ اسلام کی راہ میں خون شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے معاصی کے دفتر کو دھو دیتا

ہے اور قرآن مجید میں موجود وہ تمام وعدے، جن کو سمجھنے میں ڈاکٹر عرفان شہزاد صاحب سے غلطی سرزد ہوئی ہے، متوجہ

ہوتے ہیں۔

امید قوی ہے کہ قارئین کو اس نازک رشتے اور تعلق کا احساس ہو گیا ہوگا کیونکہ اسلام کی تاریخ سلطنت و مذہب کے

اشتراک کی تاریخ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں مکی و مدنی دونوں زندگیوں کا جمع کر دی گئی تھیں۔ آپ

کی ذات مبارک میں امامت و نبوت دونوں کو اس طرح یکم کر دیا گیا تھا، اسی لیے تو علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں

کہ ”اسلام اور سیاست کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علیحدہ کرنا ہے“۔ ان شواہد کو مد نظر رکھتے ہوئے

کسی بھی عقل سلیم کے لیے اس بات کو قبول کرنا ممکن نہیں کہ ”دین کے سیاسی غلبے کے لیے جدوجہد کرنا دینی فریضہ قرار

نہیں دیا جاسکتا۔“ یہ الفاظ مخصوص ذہنی تراش خراش کے بعد ہی زبان اور قلم سے ادا ہو سکتے ہیں کہ ”دین اسلام کو غالب

کرنے اور سیاسی طور پر نافذ کرنے کے لیے اجتماعی کوشش دین کا ایک اضافی جزو ہے اور اس قسم کی جدوجہد پر اللہ تعالیٰ

کی طرف سے اس امت مسلمہ کے ساتھ کوئی وعدہ نہیں کیا گیا اور نہ یہ جدوجہد اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کو مشروط ہے۔“

## دلائل و استدلالات کا جائزہ

اقتباس: ”قرآن میں سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں کئے گئے وعدے صحابہ کرام کے حق میں تھے جو پورے ہوئے،

عام مسلمان ان وعدوں کا مخاطب ہیں نہ مصداق۔“

تبصرہ: ہر خاص و عام جانتا ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا محکم پیغام قیامت تک تمام انسانوں کے لیے نور ہدایت

ہے جس کے اولین مخاطب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) تھے اور ان ذوات فاضلہ کے بعد قیامت تک آنے والا ہر انسان اس پیغام کے ایک ایک حرف کا مخاطب ہے۔ قرآن مجید کی عمومیت ہی اس کا اعجاز ہے۔ مثلاً کسی شخص کے بالغ ہونے یا غیر مسلم کے اسلام قبول کرنے کے بعد ”اقِمْوا الصَّلَاةَ“ کا حکم دونوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ صاحب نصاب ہونے کی صورت میں ”اتُّوا الزَّكَاةَ“ پر عمل کرنا لازم ہے۔ ماہ رمضان میں ”اتِّمُوا الصِّيَامَ“ کے حکم کا بجالا نافرہ ہے۔ حج کی فریضت کے بعد ”اتِّمُوا الْحَجَّ“ بیت اللہ کی زیارت اور مخصوص احکام کی بجا آوری کا تقاضا کرتا ہے۔ ان احکامات پر عمل کرنے کے بعد مسلمانوں کو ان احکامات کی بجا آوری پر انعام و اکرام اللہ تعالیٰ ہی کی شانیں شان ہے۔

کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کو نماز پڑھنے کا تو حکم ہے، لیکن تنہی عن الفحشاء والمنکر ان کے لیے نہیں ہے؟ رمضان کے مہینے میں مشقتوں اور تکلیفوں کو برداشت کر کے لے لے روزے رکھنے کے تو مسلمان پابند ہیں، لیکن لعلکم تتقون اور وانا اجزی بہ صرف پیغمبر اور صحابہ کرام کے لیے تھے؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ صاحب استطاعت ہونے کے بعد مسلمانوں پر مناسک حج کی بجا آوری لازمی ہے لیکن رجوع کیسوم ولدتہ امہ سے ان کا اکرام نہیں کیا جائے گا؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ صدقات و خیرات کے ذریعے مسلمانوں پر غریبوں کی مدد کرنا ایمان کا تقاضا ہے، لیکن كَمْثَلِ حَبَّةِ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلٍ فَبِيْ كُلِّ سُنْبَلَةٍ مِّائَةٌ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضْعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ (البقرة: ۲۶۱) تو آپ اور صحابہ کرام کے لیے خاص تھے؟ اگر ان احکامات کی تعمیل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزا اور بدلے کے تمام وعدے مسلمانوں کے لیے ہیں اور روگردانی کی صورت میں تمام وعیدات مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو پھر کون سے قاعدوں اور قوانین کے تحت مسلمانوں کی اسلام کے سیاسی غلبے کے لیے سیاسی جدوجہد کے وعدوں کو قرون اولیٰ کے ساتھ مخصوص کیا جا رہا ہے؟

قرآن کی کسی بھی آیت کے مفہوم کی تخصیص یا تو قرآن کی دوسری آیت کے ذریعے ممکن ہے یا پھر خبر متواتر اور مشہور کے ذریعے تخصیص کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ صرف خالص عقلی استدلال کے ذریعے تخصیص کرنا مسلمانوں کو غلط پڑھی پر گامزن کرنا ہے۔ کل کو اگر کوئی شخص نبوت کا اعلان کرے اور دعویٰ کرے کہ قرآن بچھیلی نسلوں کے لیے تھا اور موجودہ امت کے لیے مجھ پر وحی بھیجی جا رہی ہے تو موصوف اپنے پیش کردہ اصول کی روشنی میں قرآن کی صداقت کو کیسے ثابت کریں گے؟

اقتباس: ”زبان کا معروف اسلوب ہے کہ وعدہ اگر خاص کسی شخص یا اشخاص سے یا جائے تو وہی اس کا مخاطب اور مصداق ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ اس کا انکار ممکن نہیں۔“

اگر کوئی شخص کسی بچے سے کہے کہ ”امتحانات میں اچھی کارکردگی دکھانے پر اسے انعام ملے گا“، تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ بچے کو محنت کی ترغیب دی جا رہی ہے اور مطلوبہ نتائج حاصل ہونے پر اس شخص کی طرف سے بچے کو انعام دینا لازمی ہوگا، لیکن اگر نہیں دے گا تو جھوٹا ہوگا۔ ہم اللہ تعالیٰ کے غلام ہیں اگر احکام کی بجا آوری پر ہمیں جزا نہ بھی ملے

اور اللہ کی تائید و نصرت شامل حال نہ ہو تو اعتراض نہیں کیا جاسکتا، لیکن جو ذات اپنے بارے میں ومن اصدق من اللہ قبلا کا اقرار کرے، جس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہو، اور جو احکام کی بجا آوری کے سلسلے میں بار بار وعدوں کی یاد دہانی کرے تو اس کے لیے جزا اور بدلہ نہ دینا اس کے شایان شان نہیں۔

دوسری بات یہ کہ مخلوق اور خالق کے درمیان کسی بھی قسم کی مماثلت کا تصور نہیں کیا جاسکتا، چہ جائیکہ اپنے وعدوں کو خدا کے وعدوں پر قیاس کیا جائے۔ اس قسم کے استدلالات مشرکین مکہ بھی کیا کرتے تھے جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ“۔

تیسری بات یہ کہ اگر کوئی شخص کسی بچے کو ”مکتوب“ پیش کرے جس میں یہ وعدہ کیا گیا ہو کہ ”اچھی کارکردگی پر اسے انعام دیا جائے گا“، بچہ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے اور وہ شخص اپنے وعدے کے مطابق بچے کو انعام سے نوازتا ہے۔ اس کے بعد وہی ”مکتوب“ دوسرے بچے کو پکڑتا ہے اور دوسرا بچہ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر انعام کا مطالبہ کرتا ہے تو اس شخص کے لیے یہ کہنا کس طرح صحیح اور ممکن ہو سکتا ہے کہ اس ”مکتوب“ میں لکھا گیا وعدہ تو پہلے بچے کے لیے تھا، آپ کے لیے نہیں ہے، لہذا آپ انعام کے مستحق نہیں ٹھہرتے؟

موصوف نے اس عقلی استدلال کے ضمن میں چار آیتیں پیش کی ہیں:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ [سورة آل عمران: ۱۳۹]  
وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ  
كََمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ، وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَ  
لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ حَوْفِهِمْ أَمْنًا، يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا، وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ  
ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ [سورة النور: ۵۵]

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَا جَزَاءَ  
الْآخِرَةِ أَكْبَرَ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ [سورة النحل: ۴۱]

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاعِمًا كَثِيرًا وَسَعَةً [سورة النساء: ۱۰۰]

پہلی آیت میں مخاطب کے صیغوں کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے جس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان آیتوں کے مصداق صرف آپ اور صحابہ کرام ہیں اور دیگر مسلمان اس کے مصداق ہیں نہ مخاطب۔ دوسری آیت میں خطاب کے صیغے بھی مفقود ہیں، جبکہ تیسری اور چوتھی آیت میں تو خطاب عموم کے صیغوں سے کیا گیا ہے، لیکن موصوف کو اس میں بھی تخصیص کا مفہوم دکھائی دے تو کیا کہا جاسکتا ہے۔

اقتباس: ”قرآن مجید میں بڑی وضاحت سے یہ بات آئی ہے کہ خدا اپنے اصول کبھی نہیں بدلتا۔ اگر یہ وعدے عام مسلمانوں کے لیے بھی ہوتے تو کامیابی ان کو بھی نصیب ہوتی۔ چونکہ یہ وعدے مسلمانوں کے لیے تھے ہی نہیں،

اس لیے ان کے حق میں پورے نہیں ہوئے۔ خدا نے اپنا اصول نہیں بدلا۔“

یہ وعدے مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ خاص ہیں، اس کے لئے مذکورہ بالا ترتیب کے مطابق دلیل پیش کرنا لازمی ہے۔ عقل کی بنیاد پر کسی آیت کو ایک زمانے کے ساتھ مخصوص کر دینا انصافی بھی ہے اور قرآن کریم کی غلط تشریح بھی ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ وعدے مسلمانوں کے حق میں کبھی پورے نہیں ہوئے تو نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ ہمیں فقط محنت، کوشش اور جدوجہد کا مکلف کیا گیا ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی ہجرت کے بعد ملک خداداد پاکستان جو صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست کا قیام ہے، درجہ بالا آیت کی عملی تشریح ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے اصول کبھی نہیں بدلتا اور اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ جو بھی ہمارے راستے میں کوشش کریں گے، ہماری تائید و نصرت اور امداد ان کے ساتھ ضرور شامل حال ہوگی۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (العنكبوت ۶۹)

اس آیت میں شک کی گنجائش ہے نہ تاویل کی کیونکہ لَنَهْدِيَنَّهُمْ میں تاکیدات کے مجموعہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کی یقین دہانی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (النحل ۹۷) میں بھی تاکیدات کو جمع کر کے ”عام مسلمانوں“ سے وعدے کو یقینی بنایا گیا ہے۔

اقتباس: ”یہ بات ذہنی میں رہنی چاہیے کہ صحابہ نے دشمنان اسلام کے خلاف جو قتال کیا، وہ غلبہ و حکومت کے لیے نہیں تھا بلکہ خدا کے نافرمانوں کو اتمام حجت کے بعد خدا کے آخری سزا دینے کے لیے اور مظلوم مسلمانوں کو ان کے پیچہ ظلم سے چھڑانے کے لیے تھا۔“

مظلوم مسلمانوں کا مدد کے لیے پکارنے پر بلیک کہنا ہمیشہ سے مسلمانوں کا دینی فریضہ رہا ہے اور یہی غلبہ و حکومت کی بنیاد ہے۔ اگر صرف مظلوم مسلمانوں کی مدد کرنا ہی مقصود تھا تو آپ کو حیات میں اور آپ کے رخصت ہونے کے بعد صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) اور ان کے رفقاء کبھی سو سال تک ریاست و حکومت کو برقرار رکھنے کی کوشش نہ کرتے بلکہ کبھی کبھار مشاجرات تک بھی نوبت پہنچ چکی تھی۔

اقتباس: ”مسلمانوں نے دین کے نام پر غلبے کے حصول کے لیے جن مشکلات کا راستہ اپنے لیے چنا ہے، وہ ان کے دین کا تقاضا ہی نہیں ہے کیونکہ دین کا اصل مقصد تزکیہ نفس ہے۔“

اسلام ایک جامع دین ہے اور اس کے جامع ہونے کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ عبادت و ریاست کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں مرکزی حیثیت یقیناً خدا کے ساتھ لگاؤ اور تعلق کو حاصل ہے اور وہ اصلاً مطلوب ہے، لیکن خدا کے ساتھ تعلق کی استواری اور پھر اس کے بعد خدا کے عادلانہ قوانین کے نفاذ کے لیے اختیار اور طاقت کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ اس کے لیے بھی سعی و کوشش ایک دینی ضرورت ہے۔ نہ حکومت کے بغیر زمین میں فتنہ و فساد کو دفع کیا جاسکتا ہے اور نہ اللہ کے بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و امان کا قیام ممکن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان خلیفۃ اللہ ہے اور اس کا

مقصد زندگی عبادت ہے۔ عبادت کے صرف داخلی تقاضوں کو پورا کرنا اور تسبیح و مناجات میں مشغولیت کو کافی سمجھ لینا، ملت کے اجتماعی مسائل سے روگردانی اور عبادت کے خارجی تقاضوں کو جن کا تعلق خاکدان ارضی پر احکام الہی کے نفاذ سے اور غلبہ اسلام سے ہے، بالکل نظر انداز کر دینا اور ان کو اہمیت نہ دینا اور اس میدان میں کام کرنے والوں کی حوصلہ شکنی یا تحقیر کرنا دین کے متوازن تصور کے خلاف ہے۔ عبادت کے داخلی تقاضے جو ہر اور اصل کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسلامی حکومت کا قیام اور دین کے قوانین عدل کا نفاذ اس کے لئے وسیلے کا درجہ رکھتے ہیں، اس لئے وہ بھی مطلوب ہیں۔ وسیلے اور مقصد کے اس فرق کو آشکارا کرنے کے لیے قرآن کریم کا ارشاد ہے:

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (سورۃ الحج: ۴۱)

”وسیلے“ اور ”مقصد“ کے اس فرق پر مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ”ارکان اربعہ“ میں یوں روشنی ڈالی ہے:

”انسان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ اس زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے۔ چونکہ وہ اللہ کا خلیفہ ہے، اس لئے اس کے اندر ذوق علم، شوق جستجو اور زمی کے خزینوں اور دنیوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی صلاحیت بخشی گئی اور تعلیم اس کا امتیاز اسے عطا کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں انسان مسلسل رکوع و سجود اور مسلسل تسبیح و ذکر کا پابند نہیں۔ اگر وہ اس کی کوشش کرے گا تو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی حیثیت سے اپنی ناکامی کا ثبوت فراہم کرے گا۔“

اس موضوع پر سید سلیمان ندوی اپنی شہرہ آفاق کتاب ”سیرۃ النبی“ میں یوں رقمطراز ہیں:

”اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام اس کے لیے بمنزلہ تمہید تھے بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب تھے اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لیے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے تاکہ وہ احکام الہی کی تعمیل باسانی کر سکیں۔ اس لیے وہ بھی عرضاً مطلوب ہے۔“ (سیرۃ النبی جلد ۷ ص ۶)

قرآن میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھن جانے کو ذلت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ، وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ، بِيَدِكَ الْخَيْرُ، إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (آل عمران ۲۶)

”اے اللہ، حکومتوں کے مالک، تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے حکومت چھین لے۔ تو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے اور تیرے ہی قبضے میں ہر قسم کا خیر ہے۔“

اس آیت میں عزت و ذلت سے مراد سلطنت کا ملنا اور سلطنت کا چھن جانا ہے۔ بلاغت کی اصطلاح میں اسے لفظ و نشر مرتب کہتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات میں نبوت و ہدایت کے بعد حکومت و سلطنت کا ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ، فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ  
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا (النساء: ۵۴)

”یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے فضل پر لوگوں (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام) سے حسد کرتے ہیں حالانکہ ہم نے ابراہیم کی اولاد کو بھی حکمت اور عظیم بادشاہت عطا کی تھی۔“

خلاصہ بحث یہ کہ دین میں حکومت کا قیام مقصود بالذات نہیں ہے۔ جن لوگوں نے دین کی تشریح اس انداز میں کی ہے کہ تمام پیغمبروں کو خدائی فوجدار بنا کر بھیجا گیا تھا اور ان کا مشن یہ تھا کہ وہ دوسروں سے اقتدار کی کنجیاں چھین لیں، وہ تشریح کے معاملے میں عدم توازن کا شکار ہوئے ہیں۔ قرآن و سنت میں اس بات کی صراحت نہیں ملتی ہے۔ غور کیجئے تو اس میں حکمت کا پہلو ہے اور بندوں پر اللہ کی خاص شفقت نظر آتی ہے۔ اگر اس کی صراحت کر دی جاتی تو کسی ملک میں دو مسلمان بھی پائے جاتے تو حکومت کا قیام ان پر فرض ہو جاتا اور ان کے لیے یہ کام ضروری ہو جاتا، خواہ اس کے لیے ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اسی طرح سے وہ لوگ بھی عدم توازن کا شکار ہوئے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے تھے، اس لیے مسلمانوں کے لیے حکومت قائم کرنے کی کوشش غیر مشروع ہے۔

قرآن کریم میں غلبہ و اقتدار کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی بڑی آرزو اور تمنا کے طور پر ذکر کیا گیا ہے:

وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا نَصْرَ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحَ قَرِيبٍ وَبَيِّنَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ (الصف: ۱۳)

”اور ایک چیز دے گا جسے تم عزیز رکھتے ہو مدد اللہ کی اور فتح قریب۔ اور خوشی سنا دو ایمان والوں کو۔“

نصوص سے اقتدار اور غلبہ کے حصول کے اشارے ملتے ہیں۔ سیرت طیبہ اور تاریخ سے ثابت ہے کہ اس کے لیے مواقع کو استعمال کیا گیا ہے اور اسی لئے علماء اور ائمہ کرام نے اس کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے اور نظام عدل کے قیام اور مظالم کے سدباب کو ضرور قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے جتہ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ: ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ملت و مدن، دونوں قسم کے مصالح کی تدبیر و انتظام کے لئے ہوئی تھی اور چونکہ امام ان کا نائب اور ان کے امر کو نافذ کرنے والا ہوتا ہے، اس لئے یہ دونوں کام اس کے لئے ضروری ہیں اور نبی کی اطاعت کی طرف اس کی اطاعت بھی واجب ہے۔“

اللہ تعالیٰ دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائیں اور اپنی غلطی کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے کی صلاحیت عنایت فرمائے۔ آمین

### مدرسہ ڈسکورسز: سفر قطر کے احوال و تاثرات

امریکہ کی ایک معروف کیتھولک یونیورسٹی، یونیورسٹی آف نوٹرے ڈیم میں اسلامیات کے پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم موسیٰ صاحب نے پاک و ہند کے دینی مدارس کے فضلاء کے لیے "مدرسہ ڈسکورسز" کے عنوان سے ایک تین سالہ کورس متعارف کروایا ہے جو پچھلے سال شروع ہوا تھا اور آئندہ سال اختتام پذیر ہوگا۔ پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم موسیٰ کی پیدائش ساؤتھ افریقہ میں ہوئی، دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں دینی تعلیم کی تکمیل کی۔ اس کے بعد لندن میں صحافت سے وابستہ رہے اور اس کے بعد امریکہ منتقل ہو گئے۔ امام غزالی کے فلسفہ لسانیات پر پی ایچ ڈی کی۔ ان کا پی ایچ ڈی کا کام تو اب تک غیر مطبوع ہے، لیکن امام غزالی پر ان کی ایک اور کتاب Ghazali and the Poetics of Imagination زیور طبع سے آراستہ ہے جس نے ۲۰۰۵ء میں American Academy of Religion سے مذہبیات کی تاریخ میں بہترین کتاب کا نائٹل بھی حاصل کیا ہے۔ پروفیسر صاحب بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے ذیلی ادارے اقبال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ڈائلاگ سے شائع ہونے والی کتاب "دینی مدارس: عصری معنویت اور جدید تقاضے" کے مصنف بھی ہیں جو دراصل ان کی انگریزی تصنیف What is a Madrasa? کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ ہندوستانی فاضل محقق مولانا ڈاکٹر وارث مظہری نے کیا ہے۔ ابراہیم موسیٰ صاحب آج کل یونیورسٹی آف نوٹرے ڈیم (امریکہ) میں بطور پروفیسر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

پروفیسر ابراہیم موسیٰ فلسفہ لسانیات کے متخصص ہیں اور اس باب میں ابتدائی دینی تعلیم مدرسے سے لینے کی بدولت اسلامی علوم اور تراث کے ساتھ ان کا گہرا تعلق واضح طور پر ان کے کام میں محسوس ہوتا ہے۔ ان کے سامنے یہ حقیقت واضح ہے کہ اسلامی علوم و فنون کے کسی بھی پہلو پر کام تراث کے ساتھ مضبوط تعلق اور کامل فہم کے بغیر بہر صورت ادھورا ہوگا۔ اسی طرح پروفیسر صاحب یہ بھی جانتے ہیں کہ مدارس کا نظام تعلیم کئی اعتبار سے قابل نقد و اصلاح ہونے کے باوجود طلبہ کا تراث کے ساتھ گہرے فہم اور مضبوط گرفت کا رشتہ استوار کر دیتا ہے۔ انہی باتوں کو سامنے رکھ کر انہوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ مدارس میں پروان چڑھنے والی تراث فہمی کی ان صلاحیتوں کے لیے مغرب کے جدید اسلوب تحقیق اور نقد و نظر کے نئے اور متعارف منہاج کے مطابق نشوونما کا موقع پیدا کیا جائے جو ممکن ہے مستقبل میں مغرب

\* ایل ایل ایم اسکالر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔ rafeeq1857@gmail.com

اور اسلام کے درمیان علمی و تہذیبی مکالمے کی بنیاد ثابت ہو۔

اس فکر کو عملی شکل دینے کے لیے "مدرسہ ڈسکورسز" کے عنوان سے یہ پروگرام متعارف کرایا گیا جس کو مالی طور پر امریکہ کا ایک مشہور ادارہ جان ٹمپلٹن فاؤنڈیشن سپورٹ کر رہا ہے۔ اس منصوبے کو عملی شکل دینے میں پروفیسر صاحب کو نوٹے ڈیم یونیورسٹی کے رفقاءے کار، خاص طور پر ڈاکٹر ماہان مرزا کے علاوہ پاکستان سے مولانا عمار خان ناصر اور ہندوستان سے مولانا ڈاکٹر وارث مظہری کا تعاون بھی حاصل ہے۔ اس کورس کا دورانیہ تین سال رکھا گیا ہے جس کو چھ سمسٹرز میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہفتہ وار تدریسی سرگرمیاں آن لائن رکھی گئی ہیں اور استفادہ کو آسان بنانے کے لیے تدریس کے اوقات شام کے بعد رکھے گئے ہیں۔ نصاب کے طور پر علم کلام، عقیدہ، فلسفہ اور فلسفہ تاریخ کے اہم مباحث انتخاب کیا گیا ہے اور ان کی لیے کسی مخصوص کتاب کے بجائے مختلف مصنفین کی تحریریں منتخب کی گئی ہیں۔

اس کورس کا باقاعدہ آغاز پچھلے سال ہوا تھا۔ میں چونکہ اس سال شریک ہوسکا ہوں، اس لیے اپنے پہلے سمسٹر کے حوالے سے کچھ گزارشات پیش کروں گا۔

سمسٹر کے آغاز میں ہمارے سامنے عمومی سوالات رکھے گئے۔ بعد میں ان سوالات کا تفصیلی تعارف، طلبہ کی طرف سے اشکالات و جوابات کا سلسلہ اور بحث کے سیشن تک جزوی سوالات بھی شامل ہوتے گئے۔ یوں پورے سمسٹر میں زیر بحث آنے والے تقریباً تمام موضوعات کا ایک جامع خاکہ شرکاء کے سامنے آ گیا۔ ہر پہلو سے متعلق شہرہ آفاق اور نہایت معتبر اصحاب قلم کی کتابوں کے منتخبات کو تدریسی مواد کے طور پر رکھا گیا۔ تدریس کی ذمہ داری پاکستان سے مولانا عمار خان ناصر، ہندوستان سے مولانا ڈاکٹر وارث مظہری صاحب اور یونیورسٹی آف نوٹے ڈیم سے ڈاکٹر ماہان مرزا صاحب نے اٹھائی، جبکہ وقتاً فوقتاً ڈاکٹر ابراہیم موہی بھی شریک گفتگو ہوتے رہے۔

کلاسز کا انتظام اس طور پر کیا گیا کہ ایک ہفتہ قبل ہمیں اگلی کلاس میں پڑھایا جانے والا مواد بھیج دیا جاتا اور کلاس کے مقررہ دن سے ایک یا دو دن پہلے پاکستانی طلبہ کے ساتھ مولانا عمار خان ناصر جبکہ ہندوستانی طلبہ کے ساتھ مولانا ڈاکٹر وارث مظہری ایک گھنٹے کی تیاری کی کلاس منعقد کرتے۔ اس میں ہر شریک اس مواد کو پڑھ کر کلاس میں شریک ہوتا اور متن کی کسی مشکل کو سمجھنے کے لیے اپنا سوال استاد کے سامنے رکھ دیتا۔ کورس کی مرکزی کلاس شام سات بجے سے، درمیان میں عشاء کے لیے بیس پیچیس منٹ کے وقفے کے ساتھ، رات دس بجے تک چلتی۔ یہ سب سے اہم اور بنیادی کلاس ہوتی جس میں پاک و ہند کے تمام شرکاء شریک ہوتے۔ اس کو دو یا تین حصوں میں تقسیم کر کے ہر استاد اپنا حصہ پڑھاتا اور آخر میں شرکاء کے سوالات کا جواب دیتا۔ مرکزی کلاس کے علاوہ طلبہ کی استعداد میں اضافہ کے لیے چند ذیلی سرگرمیاں بھی اس کورس کا حصہ ہیں۔ مثلاً شرکاء کو تین یا چار افراد پر مشتمل گروپس میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر گروپ، ہفتہ میں ایک دفعہ یونیورسٹی آف نوٹے ڈیم کے کسی طالب علم کے ساتھ مخصوص موضوع پر انگریزی میں مکالمہ کرتا ہے۔ موضوع کا انتخاب اور متعلقہ مواد بذریعہ ای میل پہلے سے ارسال کر دیا جاتا ہے۔ ایک ہفتہ وار کلاس انگریزی زبان کے حوالے سے ہوتی ہے، جبکہ ایک کلاس تاریخ فلسفہ پر مبنی مشہور ناول Sophie's World کو گروپ کی شکل میں

مشترکہ طور پر پڑھنے کے لیے منعقد کی جاتی ہے۔

پروگرام کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ وٹنر اور سمر میں تمام شرکاء کو ایک ہی جگہ جمع کیا جائے تاکہ براہ راست مل بیٹھنے اور آپس میں بالمشافہہ گفتگو اور ایک دوسرے کے ساتھ خیالات و آراء کے تبادلہ کا موقع ملے۔ چنانچہ دسمبر ۲۰۱۷ء کے آخری ہفتے میں کورس کے سال اول اور سال دوم میں شریک پاک و ہند کے تمام طلبہ کو قطر کی حمد بن خلیفہ یونیورسٹی کے کالج آف اسلامک اسٹڈیز کی دعوت پر قطر لے جانے کا پروگرام بنایا گیا۔

## قطر میں ورکشاپ کے احوال

قطر جانے سے پہلے وٹنر انٹینسو کے لیے تدریسی مواد ہمیں بھیجا گیا اور وہاں کی مصروفیات کی تفصیلات بھی فراہم کی گئی۔ کورس کے پاکستانی شرکاء کو لاہور ایئر پورٹ سے بذریعہ سری لنکن ایئر لائن ۲۴ دسمبر ۲۰۱۷ء بروز اتوار روانہ ہوئے۔ کولمبو ایئر پورٹ پر دو گھنٹے کے وقفے کے بعد دو وح کی فلائٹ لی اور رات بارہ بجے ہم دو وح کے انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر اترے۔ دو وح کا یہ خوب صورت ایئر پورٹ دنیا کا آٹھواں بڑا ایئر پورٹ مانا جاتا ہے۔ ایئر پورٹ سے باہر ہوٹل کی بسیں انتظار میں کھڑی تھی جو ہمیں سیدھا ہوٹل لے گئیں۔ قطر میں ہم دو وح کی حمد بن خلیفہ یونیورسٹی کے کالج آف اسلامک اسٹڈیز کے مہمان رہے اور اسی کے آڈیٹوریم میں کلاسز کا انعقاد ہوتا رہا۔ حمد بن خلیفہ یونیورسٹی دو وح کے ایجوکیشن سٹی میں واقع ہے جس کا قیام ۲۰۱۰ء میں عمل میں لایا گیا۔ ہمارے قیام کا انتظام ایجوکیشن سٹی میں ہی ایک فور اسٹار ہوٹل میں کیا گیا جہاں سے کالج تک آنے جانے کے لیے گاڑیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایجوکیشن سٹی کو ”نیشنل فاؤنڈیشن فار ایجوکیشن، سائنس اینڈ کمیونٹی ڈیولپمنٹ“ نامی تنظیم نے سنٹر فار ہائر ایجوکیشن کے طور پر تعمیر کیا ہے اور اب تک یہاں چھ امریکی جامعات کے کمپسز کے علاوہ قطر نیشنل لائبریری (جس کا ذکر آگے آ رہا ہے) سمیت دیگر کئی تعلیمی ادارے قائم ہو چکے ہیں۔

قطر میں ہمارا قیام ایک ہفتہ رہا اور اس دوران کورس کے اساتذہ اور دیگر اہل علم و دانش کو سننے اور ان سے براہ راست استفادہ کے مواقع میسر آئے۔ ۲۵ دسمبر بروز پیر سے باقاعدہ ورکشاپ کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر ماہان مرزا صاحب نے اس کورس کے اہداف اور اس پورے ہفتے کی سرگرمیوں اور طریقہ کار سے متعلق مفصل بریفنگ دی اور اس کے بعد ”معاصر فکری تحدیات“ کے موضوع پر محاضرہ پیش کیا جس میں مذہب اور سائنس کے درمیان تعلق کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ مستقبل کے کیا امکانات ہیں؟ مفکرین اس پہلو کو اپنے چشمِ تخیل سے کیسے دیکھ رہے ہیں؟ ان امور بھی پر ڈاکٹر صاحب نے مختلف اہل فکر و دانش کی تحریروں کی روشنی میں تفصیلی گفتگو کی جس کی تکمیل سوالات و جوابات کے سیشن سے ہوئی۔ لंच کے بعد ڈاکٹر ماہان مرزا کے لیکچر میں زیر بحث آنے والے موضوعات پر طلبہ کے درمیان گروپس کی شکل میں گفتگو ہوتی رہی۔ مغرب کے بعد اگلے دن کے مواد سے متعلق تیاری کی کلاس ہوئی۔ رات کو حمد بن خلیفہ یونیورسٹی کی جانب سے عشائیے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں کالج آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈین پروفیسر عماد شاہین اور چند پروفیسر حضرات نے اپنے مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور پروگرام کے آئندہ مراحل پر بھی اپنی میزبانی کی پیشکش کی۔

اگلا دن یعنی ۲۶ دسمبر پروفیسر ابراہیم موسیٰ صاحب کے لیکچر کے لیے تھا۔ پروفیسر صاحب نے ”نص کی تعبیر و تشریح (Hermeneutics)، روایت اور تاریخ“ پر گفتگو کی۔ لچ کے بعد گروپس کی شکل میں مذاکرہ اور اگلی کلاس کی تیاری کے ساتھ یہ دن بھی اختتام پذیر ہوا۔

۲۷ دسمبر کو ڈاکٹر محمد خلیفہ نے ”مذہب، سائنس اور ترقی“ کے موضوع پر اور ڈاکٹر دین محمد نے ”جدیدیت، مذہب اور مختلف آراء“ کے موضوعات پر بات کی۔ لچ اور تیاری کے بعد سب شرکاء دوچہ کے ”سوق واقف“ دیکھنے کے لیے گئے۔ سوق واقف کوئی بہت پرانا شہر نہیں، لیکن دوچہ جیسے جدید شہر میں اپنے قدیم انداز، پرانے طرز تعمیر اور ہاتھ کی بنی اشیاء کی دکانوں کی کثرت کی وجہ سے یہ بازار سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہتا ہے۔ دوگھنٹے اس بازار میں گھومنے اور سیر و تفریح کے بعد ہم واپس ہوٹل پہنچے۔ مغرب کی نماز کے بعد ہم یونیورسٹی گئے جہاں اگلے دن کی کلاس کی تیاری کی گئی اور پھر یونیورسٹی کے ریسٹوران میں ڈنر پر اس دن کی مصروفیات بھی ختم ہوئیں۔

۲۸ دسمبر بروز جمعرات ڈاکٹر ناءد جانی نے (جن کا تعلق اردن سے ہے اور الجامعہ الهاشمیہ، اردن میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں) ”مسلم دنیا میں ارتقا کی تدریس“ سے متعلق تفصیلی لیکچر دیا۔

ظہر اور لچ کے بعد دوچہ میں واقع میوزیم آف اسلامک آرٹ جانے کا پروگرام تھا۔ یہ میوزیم مصنوعی جزیرے پر کئی منزلہ انتہائی عالیشان بلڈنگ اور اس میں متنوع تاریخی اور نادر ایشیا کے مجموعے کا نام ہے۔ میوزیم کی بلڈنگ کو اس طرز پر تعمیر کیا گیا ہے کہ دوچہ کی فلک بوس عمارتوں سے کسی بھی طرف سے دیکھنے والوں کو دور سے نظر آئے۔ ایک طرف وسیع و عریض سڑک اور باقی تینوں اطراف میں سمندر کا پانی۔ میوزیم کا ماحول بھی کافی خوبصورت اور پر فضا ہے۔ میوزیم کے اندر دیگر نوادرات کے علاوہ اسلامی تہذیب کے اثرات و باقیات کو بھی اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ پانی کی طرح پیسہ خرچ کیے جانے کے باوجود ابھی یہ میوزیم تاریخ اور تہذیبوں کے آثار سے محبت رکھنے والوں کے لیے تسکین کا وہ سامان نہیں رکھتا جو ہمارے ملک پاکستان کی میوزیمز میں پایا جاتا ہے۔ کاش ان کا خیال رکھنے اور سیاحوں کے لیے انھیں پرکشش بنانے پر توجہ دی جائے۔ میوزیم سے واپسی پر یہ دن بھی حسب معمول گروپس کی شکل میں اجتماعی مذاکرے اور اگلی کلاس کی تیاری کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

۲۹ دسمبر بروز جمعہ مولانا عمار خان ناصر اور مولانا ڈاکٹر وارث مظہری نے ”مذہب اور نصوص کی تاویل“ کے موضوعات پر تفصیلی بات کی۔ اس دن شرکاء میں سے کچھ اپنے دوست احباب سے ملاقات کے لیے گئے اور باقی شرکاء کے لیے اساتذہ کے ساتھ دوچہ کے علاقے نیوٹی کارنیش جانے کا پروگرام بنایا گیا۔ کارنیش بلند و بالا عمارتوں کے سائے میں ساحل سمندر کے ساتھ کلو میٹر پر پھیلا خوبصورت اور پر فضا علاقہ ہے۔ رات کو ان بلند و بالا عمارتوں سے پانیوں میں گرتی رنگارنگ روشنیاں اور سمندر سے آنے والی ہلکی ہوائیں بہت خوبصورت نظارہ پیش کر رہی ہوتی ہیں۔

۳۰ دسمبر کو تمام شرکاء کو کئی گروپس میں تقسیم کر کے ہر گروپ کو ایک یا دو اہم سوال طے کرنے اور پھر موثر انداز میں اس

کا جواب پیش کرنے کی سرگرمی دی گئی۔ اس کی تیاری اور باہمی مشاورت کے لیے وقت بھی دیا گیا۔ تمام گروپس کی طرف سے اپنے منتخب کردہ سوال یا مشکل کی تفہیم کے لیے کافی دلچسپ انداز اختیار کیے گئے۔ تعلیمی تسلسل میں تمرین کا یہ پہلو قدرے مسرور کن بھی تھا۔ لٹچ کے بعد ہمارا پروگرام دو حصہ میں قائم قومی کتب خانے کا دورہ تھا۔

## نیشنل قطر لائبریری کا دورہ

بطور نیشنل لائبریری اس کے قیام کا اعلان قطر فاؤنڈیشن کی چیئر پرسن ملکہ موزا بنت ناصر المسند کی طرف سے نومبر ۲۰۱۲ء میں قطر کے پچاسویں یادگاری دن پر کیا گیا۔ تب سے اس لائبریری پر کام شروع ہے۔ اس کا افتتاح امیر قطر خود کریں گے جس کی تقریب میں کئی دیگر ممالک کے سربراہان کی شرکت بھی متوقع ہے۔ اس لائبریری میں اب تک پندرہ لاکھ کتابیں جمع کی گئی ہیں اور کل بیس لاکھ کتابوں کی گنجائش ہے۔ میرے ذاتی مشاہدے کے مطابق تقریباً ہر کتاب پر حفاظت کی غرض سے پلاسٹک کور چڑھایا گیا ہے۔ اس لائبریری کا وزٹ کرانے کے لیے ہم سب شکر کا دو حصوں میں تقسیم کیا گیا اور لائبریری کے مختلف حصوں کا الگ الگ نمائندے تفصیلی تعارف کراتے رہے۔ اس لائبریری کی خاص بات اس کا انوکھا طرز تعمیر اور خالص کتابی دنیا میں جدید ترین ٹیکنالوجی کی تنصیب ہے۔

اس کی تعمیر کا انداز کچھ یوں ہے کہ بالکل درمیان میں تہہ خانے بنائے گئے ہیں جس میں مخطوطات اور قدیم نایاب کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ تہہ خانوں کے ارد گرد چار سو بیڑھی نما فرش ہیں جن پر الماریاں رکھی گئی ہیں اور بیچ میں پڑھنے کے لیے کرسیاں رکھی گئی ہیں۔ الماریوں میں جگہ جگہ کمپیوٹر اور آئی پیڈ نصب ہیں جن کے ذریعے کسی کتاب کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لائبریری کے ممبرز کو کتاب دی بھی جاسکتی ہے۔ پڑھنے کے بعد کتاب عملہ کو بھی واپس کی جاسکتی ہے اور لائبریری کے اندر نصب سات ڈراپ سٹیشنز کے ذریعے بھی اپنی مقررہ جگہ پر واپس بھیجی جاسکتی ہے۔ کسی بھی ڈراپ سٹیشن میں کتاب ڈالی جائے تو تین منٹ کے اندر وہ اپنی الماری تک پہنچ جائے گی۔ لائبریری کے اندر بیڑھی نما فرش، جہاں الماریاں رکھی گئی ہیں، کے نیچے لائبریری عملہ کے دفاتر، مختلف ہالز، عملی کام کے لیے مخصوص کمرے وغیرہ تعمیر کیے گئے ہیں۔ مخطوطات کی سلیٹنگ اور کمپیوٹر میں انھیں محفوظ کرنے کے لیے نہایت جدید آلات نصب کیے گئے ہیں۔ لائبریری کے مختلف حصوں کے تفصیلی وزٹ کے بعد ہمیں ایک ہال میں لے جایا گیا جہاں ایک خاتون نے اس لائبریری کے بارے میں مزید معلومات دیں۔ اس کے اہداف کیا ہیں اور اس کی رکنیت کے حصول کا طریقہ اور فوائد کیا ہیں، ان سب امور کے بارے میں تفصیلی بریفنگ دی۔

لائبریری کے وزٹ کے دوران مجھے ایک خیال بار بار آتا رہا کہ سادہ، پرسکون اور یکسوئی والے ماحول کی بنسبت ٹیکنالوجی سے بوجھل اور سہولیات سے لبریز اس ماحول میں کتاب کی طرف بھرپور توجہ کتنا آسان یا مشکل عمل ہوگا۔

ہفتے کا دن واپسی کی تیاریوں، وہاں کے پروفیسرز اور تمام اساتذہ کی اختتامی تقریروں میں گزرنے کے بعد اسی روز یعنی ۳۰ دسمبر بروز ہفتہ سری لنکن ایئر لائن کے ذریعے وطن عزیز کا رخ کیا اور ۳۱ دسمبر کو جب لاہور پہنچے تو سال ۲۰۱۷ء کا سورج اپنی الوداعی روشنیاں پاکستان اور بالخصوص اہل لاہور پر پوری فیاضی کے ساتھ بکھیر رہا تھا اور وہ نئے

سال کی آمد اور استقبال کی تیاریوں میں مگن تھے۔

## تاثرات

میکس پلانک فاؤنڈیشن کے بعد میرا کسی غیر ملکی ادارے کے ساتھ سفر اور تعلیمی دورے کا یہ دوسرا تجربہ تھا۔ دونوں میں جو چیز مجھے زیادہ عجیب لگی، وہ ان لوگوں کے ہاں وقت کی پابندی ہے۔ ان لوگوں کے لیے سب سے بیش قیمت چیز وقت ہے۔ ایک لمحہ سوچ سوچ کر خرچ کرتے ہیں اور مقررہ وقت پر نہ صرف یہ کہ خود موجود رہتے ہیں بلکہ سب دوستوں کو نہایت خوش اخلاقی اور محبت سے بلا بلا کر نظام الاوقات کا پورا پورا خیال رکھنے کا پابند بناتے ہیں۔

دوسرا خاص پہلو، اس کورس کے دوران سلیبس کی ترتیب و تدوین، تدریسی انداز، اور عملی تعلم کو آسان سے آسان تر بنانے کے لیے اختیار کردہ حکمت عملی ہے۔ یہ شاید اس کورس کی خصوصیت کے بجائے پورے مغرب کی روایت ہو۔ اولاً کسی بھی موضوع سے متعلق نہایت اہم سوالات کا تعین ہوتا ہے۔ پھر ان سوالات کے جوابات کے لیے کسی ایک کتاب یا ایک مصنف کو ہمیشہ پڑھتے رہنے کے بجائے نہایت مستند تحریروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ ان منتخبات کو سمجھنے کے لیے الگ کلاس رکھی جاتی ہے، پھر استاد کے ساتھ پڑھنے اور تنقیدی جائزہ لینے اور اپنے سوالات پیش کرنے کے لیے الگ سیشن ہوتا ہے، اس کے بعد مزید غور و فکر کے لیے طلبہ کے آپس میں مل بیٹھنے اور مذاکرے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان تمام مراحل میں بالکل بھی متوجہ نہ رہنے والے کے دماغ کے ساتھ کچھ نہ کچھ ضرور چپک جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پڑھانے کے انداز میں مسلسل تقریر اور محض لکھوانے کے بجائے مکالمہ اور طالب علم کو بولنے اور سوال پوچھنے کا موقع دینے کا اسلوب کافی مؤثر محسوس ہوتا ہے۔ تدریس کا یہ انداز اب رفتہ رفتہ پاکستان کی عصری جامعات میں بھی فروغ پا رہا ہے۔

حمد بن خلیفہ یونیورسٹی اور قطر کی نیشنل لائبریری کے ماحول سے اندازہ ہوا کہ قطر کے حکمران خاندان کے لیے عوام کو خوش رکھنا اور انھیں ہر طرح کی سہولت فراہم کرنا اولین ترجیح ہے، اسی لیے ہمیں بھی ہر جگہ عوام کے اندر اپنے حکمرانوں سے محبت کے اظہار کے مختلف انداز ملے۔ کاش پاکستان میں بھی حکمرانوں اور عوام کے درمیان ایسا ہی باہمی محبت کا رشتہ اور اس کے مثبت ثمرات دیکھنے کو ملیں۔

## ”نماز کے اختلافات اور ان کا آسان حل“

ڈاکٹر محی الدین غازی انڈیا سے تعلق رکھنے والے، دینی علوم کے ماہر اور متوازن فکر کی حامل شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر صاحب وحدت امت کے ایک متحرک داعی ہیں۔

غازی صاحب کی کتاب ”نماز کے اختلافات اور ان کا آسان حل“، ایک نہایت ہی اہم موضوع پر ایک چشم کشا کتاب ہے جس سے دین کے اندر علم کا ایک پورا پورا ڈائم بدل جاتا ہے۔ پیش لفظ میں غازی صاحب لکھتے ہیں:

”راقم کے علم کی حد تک اس موضوع پر ایک مکمل کتاب کی صورت میں یہ ایک منفرد کوشش ہے۔“

غازی صاحب نے ایک نہایت اہم علمی حقیقت کی طرف رہنمائی کی ہے جو جو جوہ امت کے ذہن سے اوجھل ہو گئی، تاہم اس کا ادراک کسی نہ کسی درجے میں بڑے علمائے محققین کے ہاں مل جاتا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے کہ دین اس امت کو تو اتر عملی کی صورت میں منتقل ہوا ہے، جس میں اہم ترین عمل نماز ہے۔ جو عمل تو اتر سے امت کو منتقل ہوا ہو، اس میں کسی قسم کے شک و شبہ اور اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

اس کی وضاحت میں غازی صاحب لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری امت نے نماز کا طریقہ سیکھ کر آگے پوری امت کو منتقل کیا، یہ سلسلہ بغیر کسی انقطاع کے مسلسل ہم تک چلا آتا ہے، اس لیے نماز میں کسی اختلاف کا کوئی سوال اٹھنا ہی نہیں چاہیے۔ نماز ایسا عمل تھا جو روزانہ دن میں پانچ بار ادا کیا جاتا تھا، اور آپ نے اسے مسلسل کئی برس صحابہ کی معیت میں کھلے عام کر کے دکھایا تھا۔ یہ نہایت آسان عمل تھا، اس کو یاد کر لینا اور دوسروں کو منتقل کرنا نہایت سہل ہے۔ آج کے گئے گزرے دور میں بھی ہر مسلم گھرانہ اہتمام کے ساتھ اپنے بچوں کو نماز سکھاتا ہے تو کیا کسی دور میں اس کے اہتمام میں کسی کوتاہی کا تصور بھی کیا جاسکتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لاکھ سے زائد صحابہ نے نماز سیکھی، اور اسے اپنی اولاد اور انھوں نے اپنی اولاد کو سکھایا اور یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اپنی تمام کیفیات اور تنوع کے ساتھ پوری امت میں تو اتر کے ساتھ رائج ہوئی ہے۔ نماز کے وہ تمام طریقے جو تو اتر عملی کی صورت میں امت میں رائج ہیں، وہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی زندہ سنتیں ہیں اور ان میں سے کسی بھی طریقے کو خلاف سنت قرار دینا تو اتر عملی سے تغافل اور سراسر غلط رویہ ہے۔

ای میل: [irfanshehd76@gmail.com](mailto:irfanshehd76@gmail.com)

رہی یہ بات کہ نماز کے طریقوں میں اختلاف کیوں ہے، تو حقیقت اس کی یہ ہے کہ نماز کے کچھ اعمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ایک طرح ادا فرماتے تھے۔ ان اعمال میں پوری امت کا ہمیشہ اجماع رہا ہے کہ وہ ایسے ہی ہیں اور ان میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں، جیسے ایک رکعت میں رکوع ایک اور سجدے دو ہیں، فجر کی نماز دو رکعات اور مغرب کی تین رکعات ہیں وغیرہ، لیکن نماز کے بعض اعمال میں آپ نے تنوع اور گنجائش رکھی تھی، آپ انہیں ہمیشہ ایک ہی انداز سے ادا نہیں کرتے تھے۔ مثلاً قیام میں ہاتھ باندھنے کی جگہ، تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین، جلسہ استراحت، قنوت کا وقت اور طریقہ وغیرہ۔ ان میں آپ نے امت کو کسی ایک چیز کا پابند نہیں کیا تھا۔ چنانچہ صحابہ تنوع کے اس دائرے میں اپنے اپنے ذوق کے مطابق کوئی ایک یا زائد طریقے اختیار کر لیتے تھے۔ صحابہ کے اپنائے ہوئے یہ مختلف طریقے مختلف علاقوں میں، جہاں جہاں وہ گئے، لوگوں میں پھیل گئے۔ یعنی یہ طریقے ان میں تو اتر عملی کے ذریعے سے رائج ہو گئے۔ پھر لوگ اپنے ہاں رائج نماز کے طریقوں سے مانوس ہو گئے اور دوسرے تنوعات کو اجنبی نظر سے دیکھنے لگے۔ پھر جب تدوین فقہ کا دور آیا تو فقہاء نے اپنے اپنے علاقوں میں رائج طریقوں کو اپنی فقہی کتب میں مدون کر دیا۔ پھر یوں ہوا کہ تو اتر عملی سے حاصل ہونے والی نماز کو فقہاء کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ نماز حنفی، مالکی، شافعی کہلانے لگی، اور یہ تاثر قائم ہوتا چلا گیا کہ گویا نماز کا طریقہ ان کے ائمہ نے طے کر کے دیا تھا، حالانکہ لوگوں نے نماز فقہاء سے نہیں سیکھی تھی، بلکہ فقہاء نے اپنے دور کے لوگوں سے سیکھی تھی۔ انھوں نے تو بس ایک تو اتر عملی کو اپنی کتب میں درج کیا تھا۔ ان کے بعد کے لوگ پھر یہ اصرار بھی کرنے لگے کہ ان کی نماز کا طریقہ ہی افضل اور مطابق سنت ہے۔ کچھ حضرات مزید آگے بڑھے اور دوسروں کے طریقہ ہائے نماز میں پائے جانے والے اختلاف کو باطل اور خلاف سنت بھی قرار دینے لگے۔ یوں وحدت امت اور دینی ہم آہنگی کی ضامن نماز فرقہ واریت کی نذر ہو گئی۔

تو اتر عملی کی اس زبردست دلیل کے سامنے نماز سے متعلق ہر اختلاف بے وقعت ٹھہرتا ہے۔ مگر افسوس کہ اس واضح اور ناقابل تردید دلیل کی طرف عموماً توجہ نہیں دی گئی۔ شروع کے دور میں امام مالک نے تو اتر عملی کو بہت نمایاں کیا۔ انھوں نے عمل مدینہ پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی، لیکن بعد کے مالکی فقہاء بھی یہ نظر انداز کر گئے کہ نماز سے متعلق یہ تو اتر عمل پوری امت کو منتقل ہوا ہے نہ کہ صرف اہل مدینہ کو، اس لیے ایسے معاملات میں ان کی طرف سے دوسرے طریقہ ہائے نماز پر طعن بے اصل تھا۔ اذان اور اقامت کے کلمات میں تکرار کے اختلاف کی نوعیت بھی یہی تھی کہ یہ اصل میں تنوع کے اختلاف تھے، کوئی بھی طریقہ اپنایا جاسکتا ہے۔ مگر یہ بھی ہر گروہ کے مسلک کی پہچان بن جانے کے بعد بلاوجہ محل اختلاف بن گئے۔

غازی صاحب نے نماز کے ہر عمل پر فقہاء کے اختلافات نقل کر کے ان کے ہاں کے معتدل اور معروف فقہاء کے اقوال بھی نقل کیے ہیں جن کے ہاں تو اتر عملی کی اہمیت کسی نہ کسی درجے میں پائی جاتی تھی اور وہ اپنے مسلک کے عمومی رجحان کے برعکس تو اتر عملی کی بنیاد پر اختلاف کو گنجائش دینے کی بات کرتے ہیں۔ بہر حال غازی صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تو اتر عملی کی دلیل کو بہت خوبی سے نمایاں کیا ہے۔

اس امت کی فقہی روایت کی تاریخ میں یہ ہوا کہ نماز کے اختلافات کو حل کرنے کے لیے تو اتر عملی کی ناقابل تردید دلیل کو پیش نظر رکھنے کی بجائے، ہر گروہ اپنی اپنی نمازوں کے مختلف طریقوں کے ثبوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب روایات سے استشہاد کرنے لگا۔ ایک گروہ نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کے پاس اپنے طریقے کے ثبوت میں احادیث دوسرے سے زیادہ ہیں، تو دوسرے نے یہ دعویٰ کر دیا کہ اس کے پاس دوسرے گروہ کے طریقہ نماز کی منسوخی کی روایات موجود ہیں۔

محمی الدین غازی صاحب نے یہ توجہ دلائی ہے کہ نماز کے سلسلے میں وارد ہونے والی روایات سے نماز نہیں سیکھی گئی، نماز تو امت نے ہر دور میں اپنے بڑوں کے عمل سے سیکھی ہے۔ ان روایات اور آثار میں البتہ نماز کے ان طریقوں میں سے بعض یا اکثر اعمال کا تذکرہ بھی آ گیا ہے، لیکن نماز کا انحصار روایات پر نہیں، عمل تو اتر پر ہے۔

غازی صاحب نے اس اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا کہ نماز کے بارے میں روایات پر انحصار کرنا یوں بھی غلط ہے کہ نماز کے بعض متفقہ اعمال کے بارے میں کوئی مستند روایت موجود نہیں۔ اس کے باوجود امت کو ان نماز کا حصہ ہونے پر کبھی کوئی شبہ نہیں ہوا۔ مثلاً خواتین کی نماز کا انداز مردوں کی نماز سے مختلف ہے، اس بارے میں روایات میں مرد و عورت کی نماز کے اس اختلاف کی تفصیل موجود نہیں، لیکن امت ہمیشہ سے متفق رہی ہے کہ خواتین کی نماز کا انداز مردوں کی نماز سے مختلف ہے۔ اسی طرح رکوع و سجدے کی تسبیحات، تشهد اور درود کا بلا آواز پڑھنا، اسی طرح جہری نمازوں کی تیسری اور چوتھی رکعت میں بنا آواز قراءت کے اجماعی عمل کے پیچھے کوئی مضبوط اور قابل اطمینان روایت موجود نہیں ہیں، لیکن ساری امت کا ان اعمال پر اتفاق ہے۔ یہ کہنا کہ کسی فقیہ کو کچھ روایات نہیں پہنچی تھیں، اس لیے انھوں نے مسائل میں اختلاف کیا تو یہ بات کبھی بکھار پیش آنے والے مسائل کے بارے میں تو کہی جاسکتی ہے لیکن نماز جیسے متواتر عمل کے بارے میں کہنا غلط ہے۔

ایک اور اہم نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غازی صاحب نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری نماز امت کو سکھائی ہے، اس میں یہ نہیں بتایا کہ اس میں کیا فرض ہے، کیا واجب اور کیا سنت۔ یہ تعین فقہانے کی جس میں اختلافات ہو گئے۔ یعنی، نماز کے وہ اعمال بھی جو سب کے نزدیک نماز کا حصہ تھے، ان کی حیثیت کہ وہ فرض، واجب یا سنت ہیں، اس تعین میں فقہی اختلاف ہو گیا، جیسے قیام میں امام کے پیچھے مقتدی کو فاتحہ پڑھنی چاہیے یا خاموش رہنا چاہیے۔ اس میں بعض فقہاء کی طرف سے تشدد برتا گیا اور فاتحہ پڑھنے یا نہ پڑھنے کی بنا پر ایک دوسرے کی نماز کو باطل تک قرار دے دیا گیا، حالانکہ اس کا حل یہ تھا کہ یہ کہا جاتا کہ اس بارے میں تو اتر عمل موجود ہی نہیں، جس کی بنیاد پر حق و باطل کا فیصلہ ہوتا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ بھی تنوع کا مسئلہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو کسی ایک طریقہ کا پابند نہیں کیا تھا، چنانچہ مقتدی اپنے مزاج و مذاق کے اعتبار سے کوئی بھی طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔

اس بے جا تشدد نے امت کو تقسیم کر رکھا ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ نماز کی کیفیت پر توجہ دی جائے جو بندے کو خدا سے اور فرد کو فرد سے جوڑنے کا ذریعہ ہے، نہ کہ نماز کے فقہی اختلافات کو ہوا دی جائے، جن کا کوئی شرعی جواز نہیں ہے۔

آخر میں غازی صاحب نے تجویز پیش کی ہے کہ فقہ کے نصاب کی تدوین نوکی ضرورت ہے۔ لکھتے ہیں:

”بلاشبہ، آج ضرورت ہے فقہ کی ایسی کتابوں کی تیاری کی، جن میں تمام شرعی دلیلوں کا احترام ہو، متواتر عملی سنت کا بھی لحاظ ہو، احادیث اور آثار کا بھی خیال ہو، اور پھر ساتھ ہی ساتھ ائمہ کرام کے اجتہاد و استنباط کا بھی احترام ہو۔ مدارس میں جب اس طرح کی کتابیں پڑھائی جائیں گی تو مثبت سوچ رکھنے والا اور پوری امت اور ساری شریعت سے محبت کرنے والا ذہن تیار ہوگا۔“

راقم کے مطابق، صرف نماز ہی نہیں بلکہ پورے کا پورا دین، اپنی عملی صورت میں اس امت کو اجماع اور تواتر کے ذریعے سے منتقل ہوا ہے۔ چنانچہ اصلی اور بنیادی دین میں پوری امت میں حقیقتاً کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا اور اس کی اس حیثیت کے باوجود جو اعتراضات یا شبہات پیش کیے گئے ہیں، وہ لائق اعتنا نہیں ہیں۔ قرآن مجید، دین کی علمی اساس ہے جو اجماع و تواتر کے قطعی ذریعے سے امت کو منتقل ہوا ہے اور سنت متواترہ سارا عملی دین ہے جو اجماع اور تواتر عملی سے امت کو منتقل ہوا ہے۔ فروعات میں اختلافات ہیں، لیکن اصل دین میں کوئی بھی اختلاف نہیں۔ یہ دین روایات پر منحصر نہیں رہنے دیا گیا۔ روایات کی اپنی جگہ اہمیت ہے، لیکن ثبوت دین کا انحصار روایات پر نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر مسلمان کو یہ کتاب ایک بار ضرور پڑھ لینی چاہیے۔ غازی صاحب سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ کتاب اگرچہ پہلے ہی کم ضخامت کی ہے، تاہم اس کے بنیادی استدلال کو بغیر فقہی تفصیلات کے الگ سے مرتب کر کے بھی شائع کریں تاکہ ایک مختصر جامع ورژن بانداز راست عام قاری کو میسر آسکے۔

## اسلام، جمہوریت اور آئین پاکستان

سیاسی و مذہبی قائدین و کارکنان کے لیے رہنما کتابچہ

**موضوعات:** جمہوریت اور جمہوری اقدار، حکومت اور اس کے مختلف شعبہ جات، جمہوریت کا اسلامی تصور، مذہبی شبہات و خدشات اور ان کا ازالہ، ملکی اور بین الاقوامی قوانین کی شرعی حیثیت، آئین پاکستان پر معترضین کے شبہات کا تنقیدی جائزہ، ووٹ کی شرعی حیثیت

ترتیب و تدوین: محمد اسرار مدنی

صفحات: 136

ناشر: مجلس تحقیقات اسلامی (پی او بکس نمبر 5، نوشہرہ، کے پی کے)

ircra313@yahoo.com / 0923-563445